بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اے ظہورِ تُو شباب زندگی

یوں تو طلوعِ اسلام کی ہر اشاعت' کسی نہ کسی رنگ میں' قرآن اور صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کے تذکارِ جلیلہ ہی کی مظہر ہوتی ہے' لیکن ربیع الاول کا مہینہ نوعِ انسان کے لئے جس خیر و برکت اور یمن و سعادت کا ضامن بنا۔ اس کے احترام کے پیشِ نظر' ہم اس اشاعت کی ابتداء بارگاہِ رسالتمآب ﷺ میں اپنی نذرِ عقیدت سے کرتے ہیں۔ اس پیشکش کے لئے جب ہم نے قلم اٹھایا تو ذہن نے فوراً پکارا کہ جو کچھ پروانۂ شمع رسالت' پرویز علیہ الرحمۃ' اپنی مایۂ ناز تصنیف' معراجِ انسانیت' میں لکھ چکے ہیں' اس سے بڑھ کر اور کیا لکھا جا سکے گا۔۔۔ چنانچہ ذیل میں ہم ''معراجِ انسانیت'' ہی سے چند صفحات پیش خدمت کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ یہ (یوں سمجھئے کہ) کتابِ سیرت کا شروع ہی کا باب ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ زمانہ قبل از نبوت میں' تلاشِ حقیقت کے لئے' قلبِ نبوی کی تڑپ اور خلش کا کیا عالم تھا۔ اس باب کا عنوان ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے' بہ دِل اُمیدوارے

قلبِ وادیٔ فاران یعنی ام القریٰ مکہ' اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ' ہر عاکف و باد کے لئے مرکزِ توجہ بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگِ حجاز کے ہر ذرہ کی عقیدت حریم کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے' اس لئے طفلک و برنا و پیر' نزد و دور سے کارواں در کارواں اپنی پیشانیوں میں تڑپنے والے سجدوں کے نذرانے لئے' رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجعِ انام کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز جذبہ ہائے عقیدت سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کون سی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت بپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کئے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے' کوئی سیٹیاں بجاتا ہے' کوئی کعبہ

کے گرد گھوم گھوم کر' سفر ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پر جانور ذبح کر کے اس کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا جام اور سبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو اپنے صبر گریز پا اور رنج گراں نشیں کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیان اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے کے دل کو مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرہ سے اس کے طرۂ امتیاز میں بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور گاہ کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتش انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزم شعر خوانی آن کی آن میں رزمگاہ بن جاتی ہے۔ لیکن محفل عیش وطرب ہے یا میدان جنگ و جدل' ہر شخص پورے جذب وانہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہمہمہ اور طنطنہ میں' دنیا و مافیہا سے بے خبر' یوں مستغرق ہو جاتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جا سکتی۔ چھوٹا بڑا' امیر غریب' مرد عورت' سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہوتے ہیں گویا یہ چیزیں ان کی زندگی کا جزو بن چکی ہیں۔

لیکن مکہ کی ان پر ہجوم گلیوں میں ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرز معاشرت' وضع قطع' تراش خراش' سب ان ہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے' انہی لوگوں سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے' لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کوئی خلاء محسوس کرتا ہے اور نہیں جانتا ہے کہ وہ خلا کیا ہے اور کس طرح پر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل ومشارب جو اس کی قوم کا جزو زندگی بن چکے ہیں' اس کے لئے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبین نیاز میں ذوق عبودیت کے سجود رقصاں لے کر حریم کعبہ تک جاتا ہے لیکن وہ ان تابندہ گوہروں کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ اسے وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی چوکھٹیں اس متاع گراں بہا کے شایان شان دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ جب لوگوں کی گردنوں کو ان کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ۔۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے جوہر ذاتی کا کوئی دخل نہ ہو وہ باعث فخر وتکبر ہو سکتی ہے۔ وہ بزم مے پرستی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کا قلب سلیم اباء کرتا ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم نہیں اٹھاتا' کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن نظر آتے ہیں۔ وہ جب ان محافل ومجالس میں اپنے لئے کوئی سامان تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے ان علماء ومشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کونسی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن اسے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی تصورات کے ایسے ایسے رنگین فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصلی روشنی کو بالکل ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ

یہاں سے بھی ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودان باطل سے متنفر ہیں وہ ان کی طرف رخ کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اسے تلاش ہے لیکن اسے ان کا ذوق بھی تشنہ اور تڑپ خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آجاتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اسے ایسا کوئی رفیق نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش وخلش اور سوز وگداز کا حال کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپیدا کنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ گاہ اسے ستاروں کی تابندگی دعوت غور وفکر دیتی ہے اور گاہ ماہ عالمتاب کی درخشندگی اس کے لئے سامان تدبر پیدا کرتی ہے' وہ مظاہر فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا' اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آ گیا؟ کون اسے بایں حسن وخوبی چلا رہا ہے؟ اس کا بالآخر مقصد کیا ہے۔ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگئ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اتنا ہے کہ وہ اس کاوش واضطراب کو اپنے معمولات زندگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروبار معاملات' بال بچوں کی نگہ پرداخت' رفقاء واحباب سے میل ملاقات' معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا اور ایسی زندگی بسر کئے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے' بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مداح ہیں اور اس کی صداقت ودیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں اور قبیلہ اور خاندان کو اس کی شرافت اور نجابت پر ناز ہے لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے۔ اس لئے کہ جن گوشوں کو انہوں نے اپنے لئے وجۂ اطمینان اور موجب تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے دل کے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا اور وہ اپنے آپ کو ہر وقت کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب وبے قرار پاتا ہے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے؟

قرآنِ کریم نے حضور ﷺ کی تلاش حقیقت میں سرگردانی کی اس کیفیت کو دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جب فرمایا ہے کہ

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى o (93/7)

ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔

کارلائل نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے۔

میں کیا ہوں؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟

موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہئے؟

مجھے کیا کرنا چاہئے؟

حرا اور سینا کی پہاڑیاں۔ ریت کے ٹیلوں کا سکوت۔ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ چرخ چیزیں اور اس کے درخشندہ ستارے بھی کچھ جواب نہیں دیتے تھے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی اس وحی سے ملنا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنا لے۔''(Heroes and Hero-worship-- P.49)

ہاں! ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا۔ حقیقت کا انکشاف ناممکن ہے جب تک حقیقت خود اپنے آپ کو کسی پر منکشف نہ کر دے' مسائل حیات نہیں سمجھے جا سکتے جب تک ''حیات'' خود ہی ''شارح اسرار حیات'' نہ ہو جائے۔ حقیقت کے مشاہدہ کے لئے انسان کی آنکھ وحی کی روشنی کی محتاج ہے اور نبی قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت' قبل از رسالت' حضور ﷺ کی تھی۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ o(42/52)۔

اور اے محمد! اسی طرح ہم نے (اپنے قانون مشیت کے مطابق) تیری طرف اپنے حکم سے ایک کتاب بطور وحی نازل کی (جس نے تجھ پر حقیقت کو منکشف کر دیا۔ ورنہ) اس سے پہلے تجھے قطعاً معلوم نہ تھا کہ کتاب (الٰہی) کیا ہوتی ہے اور ایمان کس چیز کا نام ہے۔ لیکن (وحی کے ذریعے) ہم نے اس کتاب کو تیرے لئے ایک (عظیم القدر) روشنی بنا دیا جس کے ذریعے ہم' اپنے قانون مشیت کے مطابق اپنے بندوں میں سے

کسی ایک (یعنی نبی) کو حقیقت کا راستہ دکھا دیتے ہیں اور (اے پیغمبر! یہ ہماری اس عطا فرمودہ روشنی ہی کا صدقہ ہے کہ) تو (گم کردہ راہ لوگوں کو) سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

نہ حضورؐ جانتے تھے کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور وحی کیا ہوتی ہے اور نہ ہی اس کی توقع رکھتے تھے کہ آپ اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز کئے جائیں گے۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ o (28/86)

اور اے پیغمبر! تجھے کسی طرح یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ (ہماری طرف سے) تجھ پر کوئی کتاب نازل کی جائے گی۔ یہ تو محض تیرے پروردگار کی رحمت ہے (کہ اس نے تجھے اس عظیم منصب کے لئے منتخب فرما لیا) سو جو لوگ اس صداقت سے انکار کریں اور اس سے سرکشی برتیں تیرے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ کسی طرح ان کا پشت پناہ بن جائے۔

اس کتاب کے ذریعہ حضور ﷺ کو ان حقائق کا علم دیا جن کے متعلق اس سے پہلے آپ ﷺ کچھ نہیں جانتے تھے۔

وَ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ..... (4/113)

اور (اے پیغمبر) خدا نے تمہیں وہ باتیں سکھلا دیں جو تجھے پہلے معلوم نہ تھیں۔

پہلی وحی

حضور ﷺ کی عمر کا چالیسواں سال تھا' رمضان کا مہینہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2/185)۔ اور رات کا وقت [1]۔ رات اس لئے کہ ساری دنیا جہالت کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی تھی اور طلوع سحر کی منتظر۔ یہ رات تاریخ عالم میں عدیم النظیر اور فقید المثال رات تھی۔ یہ حدِ فاصل تھی دنیائے قدیم اور جہانِ نو میں۔ اس رات' ضمیر کائنات نے ایک نئی کروٹ لی جس سے زندگی' جو اپنے مقام سے بے خبر چلی آ رہی تھی' خود نگر و خود شناس ہوگئی۔ تمام نظامہائے کہن جو غیر فطری بنیادوں پر استوار تھے' باطل قرار پا گئے اور دنیا کو ایک نیا آئین عطا ہوا جس میں تکمیلِ شرفِ انسانیت کی تمام راہیں واضح طور پر سامنے آ گئیں۔ انسان کو حق و باطل کی تمیز کے صحیح پیمانے عطا ہوئے۔ اس لئے اس رات کو لیلۃ القدر۔ (97/1)۔ کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی جدید پیمانوں کی رات۔ اسی کو دوسری جگہ لیلۃ مبارکۃ کہا گیا ہے جس میں حق و باطل نکھر کر الگ الگ ہوگئے (44/3) دنیا نے اس رات کی عظمت کو نہیں پہچانا' اسی لئے وہ ابھی تک تاریکیوں کے جہنم میں ڈوبی ہوئی ہے اور ہزار ہاتھ

---

[1] قرآن کریم نے اس کے لئے لیل کہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پہلی وحی کا وقت بھی رات کا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا' جہالت کی جن تاریکیوں میں لپٹی ہوئی تھی' اس کی وجہ سے اس زمانے کو تشبیہاً لیل (رات) کہا ہو۔

پاؤں مارنے کے باوجود زندگی کے صحیح راستہ پر گامزن نہیں ہوسکی۔ جس دن یہ حقیقت اس کی سمجھ میں آ گئی کہ کائنات کی شبِ دیجور کی تاریکیاں اس مہر عالمتاب کی ضوفشانیوں سے دور ہوسکتی ہیں جو اس لیلتہ القدر کی صبح کو نمودار ہوا تھا۔ منزل انسانیت کی سیدھی راہ (صراط مستقیم) اس کے سامنے آ جائے گی۔ راستہ اب بھی موجود ہے اور وہ مہر عالمتاب اپنی پوری تابندگی سے نور افشاں بھی۔ صرف اتنی کمی ہے کہ انسان نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں جس سے وہ اس روشنی سے محروم ہے۔ جس دن اس نے اپنی آنکھیں کھول لیں، سیدھا راستہ اس کے سامنے آ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن کے واقعۂ عظیمہ کو نوع انسانی کے لئے جشن مسرت قرار دیا ہے کہ اس سے دنیا کو اس کی چھنی ہوئی بینائی واپس ملی تھی اور کسی اندھے کی زندگی میں اس واقعہ سے زیادہ قابل یادگار اور کون سا واقعہ ہوگا جس میں اس کی بصیرت رفتہ کی بازیابی ہوئی ہو۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَ ھُدًی وَّ رَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ o قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَ بِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ o (10/58-57)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک ایسی چیز آ گئی ہے، جو موعظت ہے، دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا ہے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں۔۔ (اے پیغمبر!) تم کہو، یہ اللہ کا فضل ہے، اور اس کی رحمت۔ پس چاہئے کہ اس پر خوشیاں منائیں اور یہ ان ساری چیزوں سے بہتر ہے جسے وہ (دنیا کی زندگی میں) جمع کرتے رہتے ہیں۔

یہ تھی وہ لیلتہ القدر جس میں حضورﷺ کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔

نبوت کے متعلق دوسرے مقام پر تحریر ہے:

مقامِ نبوت

نبوت کا مقام اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا، قلب میں روشنی، خون میں حرارت، بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نبی کا پیغام انقلاب آفریں، دین و دنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مردوں کی بستی میں صور اسرافیل پھونک دیتا ہے۔ اس سے قوم کے عروق مفلوج میں پھر سے خونِ حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ملت کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت دے دیتا ہے۔ وہ اپنی ہوش ربا تعلیم اور محیر العقول عمل سے باطل کے تمام نظامہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیڑ کر آئین کائنات کو ضابطۂ خداوندی پر متشکل کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ آرزوئیں آنکھیں ملتے ہوئے

اٹھتی ہیں۔ ولولے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ روح کی مسرتوں کے چشمے ابلتے ہیں۔ قلب وجگر کی نورانیت کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ تازہ امیدوں کی کلیاں مہکتی ہیں' زندہ مقاصد کے غنچے چٹکتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا صحنِ چمن' دامانِ صد باغبان وکفِ گلفروش کا فردوسی منظر پیش کرتا ہے۔ حکومت الٰہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانین خداوندی کا نفاذ اس کا منتہا ہوتا ہے۔ جب اس کے ہاتھوں خدا کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی طاقت پہاڑوں کے غاروں میں سر چھپاتی پھرتی ہے۔ جور واستبداد کے قصرِ فلک بوس کے کنگورے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان وسرکشی کے آتشکدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی قدوسی جماعت کے ساتھ اعلائے کلمتہ الحق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح وظفر اس کی رکاب چومتی ہے۔ شوکت وحشمت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ سرکش اور خود پرست قوتیں اس کے خدائے واحد القہار کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے' ان انقلاب آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین وتبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔۔۔ان اللہ و مَلٰئِکتہ یصلون علی النبی۔

یہ ہے کائنات کا وہ عظیم انقلاب جس کی یاد ہر سال' ربیع الاول کے مبارک مہینے میں ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یاسر مجید صدیقی

نعت

قدم بڑھایا جو راہِ دل میں تو دفعتاً یہ مقام پایا
خدا کو اپنے قریب دیکھا، خِرَد کو اپنا غلام پایا

تری جبیں کا ہے فیض جاری، نئے ستارے ابھر رہے ہیں
فنا محبت میں تیری ہو کر جنہوں نے سوزِ دوام پایا

فلاسفہ کے دماغ گم ہیں، نِگوں ہے شاہوں کی پادشاہی
قرار آخر یتیم اُمّی ہی اُمّتوں کا امام پایا

نظامِ کہنہ کے ریگزاروں میں جب بگولے بپھر چکے تھے
تو عشق و مستی کے کارواں نے تری اماں کا پیام پایا

جہانِ تازہ کے سب عناصر تری ہدایت پہ گامزن ہیں
ہوا نے تجھ سے اڑان سیکھی صبا نے ناز و خرام پایا

تضاد اضداد کا مٹانا تری فراست کا معجزہ ہے
کہ حرّیت کو کمال بخشا تو بندگی نے نظام پایا

اصول و آئینِ حکمرانی، معانیِ عدلِ اجتماعی
ہزار صدیوں کی جستجو تھی، یہ قصہ تجھ پر تمام پایا

کمالِ نقدِ ادب بھی ششدر، ادیب و شاعر بھی دم بخود ہیں
میانِ صحرا میں ایسا نادر بلیغ و دلکش کلام پایا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیغام برؐ اِنقلاب

(10 جون 1968ء کو میلاد النبی ﷺ کی تقریب پر وائی ایم سی اے ہال (لاہور) میں دیا گیا پرویز علیہ الرحمتہ کا خطاب)

صدر محترم وعزیزانِ گرامی قدر!

سلام ورحمت

موجودہ تقریبات

ربیع الاول کا مقدس مہینہ' نور ونکہت کی ہزار جنت سامانیاں اپنے جلو میں لئے' پھر وجہٗ تابانی عالم ہوا۔ جیسا کہ میں نے' ایک دفعہ اسی تقریب کے سلسلہ میں کہا تھا' میرے نزدیک' ہمارے ہاں جشن مسرت کے تیوہار دو ہی ہیں۔۔۔ ایک جشن نزول قرآن' کہ جسے عیدالفطر کہا جاتا ہے' اور دوسرا عید میلاد النبیؐ۔ اور اصل یہ ہے کہ یہ دونوں تیوہار بھی ایک ہی سکہ کے دو رخ اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ قرآن' حرف ونقوش میں خدا کا کلام ہے اور سیرت صاحبِ قرآن' خود قرآن کی محسوس تعبیر اور درخشندہ تفسیر۔ سیرت طیبہ کی یہی اہمیت تھی جس کی وجہ سے اس کے اصولی گوشوں کو خود قرآن نے اپنے دامن میں محفوظ کر کے اسے ابدیت درکنار کر دیا۔ ہمارے ہاں کچھ عرصہ سے اس تقریب کو بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ لیکن' جیسا کہ ہر اس قوم کے ہاں ہوتا ہے جو عقل وفکر اور علم وبصیرت سے کام لینے کے بجائے اپنے معاملات کو جذبات کے طوفانوں کی نذر کر دے' یہ تقریب کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ بننے کے بجائے' محض نمائشوں اور آرائشوں کا بے روح مظاہرہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان جلوسوں کو چھوڑیئے جن میں ہر قسم کی بازاریت کے مظاہرے ہوتے ہیں' آپ میلاد کی کسی مجلس میں جایئے' وہاں جھوم جھوم کر نعتیں پڑھی جائیں گی' لیکن ان نعتوں میں ہوگا کیا؟ زلف وخط وخال کے حسین تذکرے' کاکلِ مشکیں اور گیسوئے عنبریں کی شیریں حکایتیں' سروقامتی اور لالہ رخساری کی دل افروز داستانیں۔ ہجر ووصال کے جانسوز افسانے' اور اب تو انتہا یہ ہے کہ ان نعتوں کی دھنیں بھی فلمی گیتوں سے نقل کی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر آپ تھوڑے سے وقت کے لئے آنکھیں بند کر لیں' تو تمیز ہی نہ ہو سکے کہ آپ میلاد کی مقدس مجلس میں بیٹھے ہیں یا کسی سینما ہال میں۔

اور اگر آپ میلاد کی مجلس سے اٹھ کر' وعظ کی محفل کی طرف جائیں تو وہاں آپ کو یا تو اس قسم کی بحثیں سنائی دیں گی کہ حضورؐ نور تھے یا بشر۔ اور یا آپؐ کے معجزات کا محیر العقول بیان ہوگا۔ میں اس وقت معجزات کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔

میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (33/21)۔

تمہارے لئے رسول کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

ظاہر ہے کہ جب معجزات کا ظہور ہم سے ممکن ہی نہیں تو حضور ﷺ کے معجزات ہمارے لئے اسوہ (ماڈل) کس طرح بن سکتے ہیں۔ ہمارے لئے تو آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کا وہی حصہ نمونہ بن سکے گا جسے ہم خود عمل میں لاسکیں۔

اور اگر آپ' ان محفلوں کو چھوڑ کر' کسی ماڈرن جلسہ گاہ میں جا پہنچیں تو وہاں بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ بعثت نبی اکرم ﷺ سے پہلے عربوں میں اس قدر خرابیاں تھیں۔۔شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی' جوئے کے وہ بے حد رسیا تھے۔فحش کلامی ان کی محفلوں کی زینت تھی' بات بات پر مشتعل ہوکر جنگ وقتال پر اتر آنا' ان کا انداز زیست بن چکا تھا۔۔۔آپؐ نے ان کی ان خرابیوں کو دور کیا اور انہیں ایک مہذب اور شائستہ قوم بنا دیا۔اس میں شبہ نہیں کہ معاشرہ کی اس قسم کی خرابیوں کی اصلاح' قابل ذکر کارنامہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خدا کا ایک ایسا جلیل المرتبت رسول' جو نبوت کے سلسلہ دراز کی آخری کڑی ہو اور جس کے پیغام نے' تمام نوع انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ زندگی بننا ہو' کیا اس کا کارنامہ اتنا ہی تھا کہ اس نے چند معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کر دی اور اس قوم کو ایک وسیع سلطنت کا وارث بنا دیا؟ اس قسم کی حاصل کائنات' برگزیدۂ روزگار ہستی کے کارنامے یقیناً اس سے کہیں زیادہ عظیم اور کہیں بڑھ کر جلیل ہوں گے۔ جس ذات گرامی ﷺ کو خود خدا نے رحمتہ للعالمین قرار دیا تھا اس کے سحاب کرم کی گہر باریوں کو حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہونا چاہئے اور وہ ایسی ہی تھیں۔

رسول ﷺ کی بعثت کا مقصد

ایک رسول کی بعثت کا مقصد کیا ہوتا ہے' اسے علامہ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں' ایک مقام پر' نہایت مختصر لیکن بڑے جامع اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> رسول' اس لئے آتا ہے کہ زمانے کے طوفانوں پر تسلط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے (مضرابِ وحی سے) اس کے نفس قدسی میں ایسی ولولہ انگیز قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آرزو' کہ جو کچھ اس نے (وحی کی روشنی میں) دیکھا ہے' وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے' نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آ گئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

بالفاظِ دیگر' ایک رسول آتا اس لئے تھا کہ جو دنیا اس کے سامنے ہو اس کی جگہ ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔لیکن یہ ظاہر ہے کہ خارجی کائنات میں ایک نئی دنیا بسانے کے لئے' اسے دلوں کی دنیا کو بدلنا پڑتا ہے۔انسانی فکر ونظر میں ایک انقلابِ عظیم برپا کرنا ہوتا ہے۔اس لئے کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

وہ دنیا کے مروجہ اعتقادات' نظریات' تصورات' خیالات کو ایک ایک کر کے لیتا ہے اوران کی بنیادوں تک کو اکھیڑ کر' ان کی جگہ جدید تصورات ونظریات کی دنیا بساتا ہے وہ نگاہوں کے زاویے بدل دیتا ہے۔ وہ اقدار کے پیمانے بدل دیتا ہے' وہ خیر وشر کا معیار بدل دیتا ہے' وہ نصب العینِ حیات بدل دیتا ہے' وہ کاروان انسانیت کی منزلِ مراد بدل دیتا ہے' وہ زندگی کا مقصود بدل دیتا ہے۔ مقصود کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ غرضیکہ وہ قرآن کی زبان میں ۔۔ یہ زمین بدل دیتا ہے۔ یہ آسمان بدل دیتا ہے اوران کی جگہ ایک نئی زمین کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک نیا آسمان وجود میں لاتا ہے۔ اس کی نگاہ' انسانی فکر کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے' جس سے ہر بنائے کہنہ ویران ہو جاتی ہے اور اس تخریب کے بعد وہ فکر ونظر کے ان ویرانوں میں' دنیائے تصورات کی ایک نئی جنت آباد کرتا ہے۔ ایک رسول درحقیقت

پیغام برِ انقلاب

ہوتا ہے۔ ایک عظیم انقلاب کا پیغام بر۔۔۔ ایسے عظیم انقلاب کا پیغام بر جس کا تصور تک بھی فکر انسانی نہیں کر سکتی ۔۔ نظریات ومعتقدات کی دنیا میں انقلاب برپا کرنا' کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ چھوٹے سے پیمانے پر اس کا اندازہ آپ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے کسی دوست سے اس کی عزیز سے عزیز دنیاوی متاع مانگیں' وہ بخوشی دے دے گا۔ لیکن آپ اس کے کسی عقیدہ کو غلط کہہ دیں' آپ دیکھئے گا کہ اس سے دوستی کے کتنے کتنے مضبوط رشتے ٹوٹ جاتے اور رفاقتوں کے کیسے کیسے محکم عہد و پیمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ رسول' یہ آسمانی انقلاب کا داعی' کسی ایک فرد کے عقیدے کو غلط نہیں ٹھہراتا۔ وہ سارے معاشرہ کے عقیدے کی تغلیط کرتا ہے اور معاشرہ کے کسی ایک عقیدہ کی تردید وتکذیب نہیں کرتا' اس کے تمام معتقدات ونظریات کو باطل ٹھہراتا ہے۔ اسی کا نام' قرآن کی اصطلاح میں' ''کفر بالطاغوت'' ہے جو ایمان باللہ کی تمہید ہوتا ہے۔ یہی لا الٰہ' اس داعیٔ انقلاب کے پروگرام کی پہلی اور لاینفک کڑی ہوتی ہے۔ وہ جب تک دلوں کے کعبہ سے ہر کہنہ صنم کو نکال باہر نہیں کرتا' اس کے اندر قدم نہیں رکھتا۔ یہی وہ ہمت طلب اور شکیب آزما مرحلہ تھا جسے قرآن نے ایک حوصلہ شکن فریضہ قرار دیا تھا جب کہا تھا کہ و وضعنا عنک وزرك الذی انقض ظهرك۔ (94/2-3)۔ ''ہم نے تمہارے سر سے اس بوجھ کو اتار دیا جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔''

دنیائے مذہب میں انقلاب

اس قسم کی انقلاب آفرینی' دنیائے تہذیب اور جہان تمدن میں بھی کچھ کم مشکل نہیں ہوتی' لیکن مذہب کے تراشیدہ بتوں کو توڑنا اور توڑنا بھی مذہب ہی کے تیشوں سے' انتہائی جانگسل اور (بظاہر) ناممکن العمل پروگرام ہوتا ہے۔ اگر کوئی دہریہ اور مادہ پرست' مذہبی تصورات کی تردید کرے تو اس کی یہ حرکت قابل فہم ہوگی۔ لیکن مذہب کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر مذہب کے خلاف دعوت انقلاب دینا' نہ صرف دشوار ترین فریضہ ہوگا بلکہ محیر العقول اقدام بھی۔ میں آج کی نشست میں' عزیزان گرامی قدر! مختصر الفاظ میں یہ عرض کروں گا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے خود مذہب کے مسلمات میں کس قدر عظیم انقلاب برپا کیا' اور یوں عالمگیر انسانیت کو' انسانوں کے خود تراشیدہ معتقدات کی ان زنجیروں سے چھڑایا جن میں وہ

صدیوں سے جکڑے چلی آ رہی تھی' اور جن کے خلاف لب کشائی کرنا تو ایک طرف' دل میں گرانی تک محسوس کرنا بھی' کس طرح ان کی روح میں کپکپی پیدا اور دلوں میں لرزہ طاری کر دیتا تھا اور یہی حضورﷺ کا وہ معرکہ آرا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے' عالم انسانیت' قیامت تک' اس محسن اعظمؐ کا زیر بار احسان رہے گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

خدا کا غلط تصور

مذہب کی دنیا میں' بنیادی تصور خدا کا ہے (ایک آدھ کو چھوڑ کر) تمام مذاہب عالم میں مذہب پرست ہونے کے لئے خدا پر ایمان شرط اولین ہے۔ لیکن نبی اکرمﷺ کے ظہور قدسی سے پہلے' تمام مذاہب میں خدا کا تصور ایک مطلق العنان' مستبد آمر (ڈکٹیٹر) کا سا تھا' جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ تھا نہ قانون۔ نہ کوئی دستور تھا نہ آئین۔ وہ جو جی میں آئے کرتا اور جس قسم کا جی چاہے حکم صادر کر دیتا تھا۔ دنیا کے شہنشاہوں کی طرح' وہ اپنے تخت حکومت پر بیٹھا' انتہائی دبدبہ اور جلال سے حکمرانی کرتا تھا۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ (سعدی کے الفاظ میں) گاہے بسلامے برنجد و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشد۔۔ کبھی موج میں آ گیا تو گالیاں دینے والوں کو جاگیریں عطا کر دیں۔ غصہ میں آ گئے تو سلام کرنے والے کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ وہ جو کرتا تھا اس کے لئے اسے نہ کسی کو وجہ جواز بتانے کی ضرورت تھی نہ دلیل و حکمت بیان کرنے کی حاجت۔ موت اور زندگی' خوش حالی اور تنگ دستی' امیری اور غریبی' عزت اور ذلت' سب اس کے قبضہ قدرت میں تھی۔ وہ جس سے خوش ہوتا ایک آن میں لاکھوں کا مالک بنا دیتا اور جس سے ناراض ہوتا اسے نان شبینہ تک کا محتاج کر دیتا۔ اس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ نہ کوئی اس سے پوچھ سکتا تھا کہ اس نے اسے کیوں تباہ کر دیا۔ نہ اتنا دریافت کر سکتا تھا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں اس قدر سخت سزا دی گئی۔ یہ سب اس کی خوشی اور ناراضگی پر منحصر تھا۔ اس لئے ہر ایک کی ہر وقت یہ خواہش اور کوشش رہتی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے (دنیاوی بادشاہوں کی طرح) اسے خوش رکھنے کے لئے کبھی اس کی ثناء میں حمد و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے اور کبھی اس کے حضور رو رو کر' اور گڑگڑا گڑگڑا کر' رحم کی درخواستیں کی جاتیں۔ کبھی اس کی بارگاہ میں نذرانے پیش کئے جاتے اور کبھی اسے قربانیوں اور چڑھاووں سے خوش کیا جاتا۔ لیکن یہ کچھ کرنے کے باوجود' ہر شخص اس کے عتاب سے ڈرا ڈرا' سہما سہما رہتا' کہ نہ جانے وہ کس وقت غصہ میں آ کر کیا کر دے۔

خدا کے مقربین

دنیاوی بادشاہوں کی طرح' خدا کا ایک دربار بھی ہوتا تھا جس میں اس کے ''مقربین'' اس کے گرد و پیش مسند نشین ہوتے۔ باہر حاجب و دربان ہوتے' اس لئے اس تک کسی شخص کی براہ راست رسائی نہ ہو سکتی۔ اس تک درخواست پہنچانے کے لئے وسیلوں اور سفارشوں کی ضرورت تھی اور یہ وسیلے اور سفارشی وہی تھے جو اپنے آپکو اس کا مقرب کہتے تھے۔ عوام بیچاروں کے کام' ان کے وسیلوں اور سفارشوں کے بغیر نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے انہیں خدا کی ہی خوشامد نہیں کرنی پڑتی تھی' ان مقربین کے حضور بھی ہر وقت سجدہ ریز رہنا پڑتا تھا۔ ان مفلسوں اور غریبوں' مظلوموں اور بیکسوں' محتاجوں اور لاچاروں کے دل پر خدا کا خوف ہی مسلط نہیں رہتا تھا۔ یہ ''مقربین بارگاہ خداوندی'' بھی ان کے اعصاب پر ہوّا بن کر

سوار رہتے تھے۔

مفاد پرست گروہوں کا تراشیدہ تصور

خدا کا یہ تصور درحقیقت' مفاد پرست گروہوں کا پیدا کردہ تھا۔ اس گروہ میں سرفہرست خود بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو خدا کا اوتار' یا ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ اور عکس) قرار دیتا تھا۔۔ خدا کا یہی تصور تھا جو اس زمانے کے مطلق العنان بادشاہوں اور مہاراجوں کو (Suit) کرتا تھا۔ ان کی ہر دھاندلی کی سند یہ تھی کہ وہ عین خدائی احکام اور فیصلوں کے مطابق تھی۔ جس طرح خدا کے کسی حکم یا فیصلہ کے خلاف' لب پر حرف شکایت لانا تو ایک طرف' دل کی گہرائیوں میں بھی کبیدگی محسوس کرنا' خدا کے عتاب کا مستوجب بننے کے لئے کافی تھا' اسی طرح حکمران کے کسی فیصلے سے سرتابی کا تصور بھی انتہائی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح' خدا سے کوئی چیز بطور استحقاق طلب نہیں کی جاتی تھی۔۔ بطور خیرات مانگی جاتی تھی۔۔ اسی طرح بادشاہ سے بھی اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگا جا سکتا تھا۔ سب کچھ اس کے رحم وکرم پر موقوف تھا۔

مذہبی پیشوائیت

اس فہرست میں' بادشاہوں کے بعد' مذہبی پیشواؤں کا نمبر آتا ہے۔ یہ خدا کے مقرب سمجھے جاتے تھے۔ خدا تو نہ کسی کے سامنے آتا تھا' نہ کسی سے براہ راست بات چیت کرتا تھا۔ اس لئے یہ ''تقدس مآب گروہ'' خدا کا نمائندہ بن کر' زمین پر خدائی کرتا تھا۔ لوگوں کے دل میں' بادشاہ' بلکہ خدا کا اتنا ڈر نہیں تھا جتنا ان نمائندگان خدا کا خوف تھا۔ بادشاہ اور ان مذہبی پیشواؤں۔۔ فرعون اور ہامان۔۔ کا باہمی گٹھ جوڑ تھا۔۔ یہ بادشاہ کو خدا کا اوتار قرار دے کر' لوگوں سے اس کے حضور سجدے کراتے' وہ انہیں ''روحانی مملکت'' کے ارباب بست وکشاد ٹھہرا کر' عوام سے ان کی پرستش کراتا۔

سرمایہ دار طبقہ

نوع انسان کے ان شکاریوں میں' تیسرا درجہ ''جاگیرداروں' زمینداروں' سرمایہ داروں کا تھا''۔ جو رزق کے سرچشموں پر قابض ہو کر' مزدور اور محنت کش طبقہ سے اپنی من مانی کراتے۔ مذہبی پیشوائیت' ان مفلوک الحال' مفلس و محتاج محنت کشوں کو یہ کہہ کہہ کر سلائے رکھتی کہ چونکہ رزق کی بست وکشاد خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اس لئے ان سرمایہ داروں کی بے حد وحساب دولت پر حسد کرنا یا اپنی مفلوک الحالی پر شکوہ سنج ہونا' خدائی فیصلے کے خلاف سرکشی کرنا ہے۔ اس لئے اس کا خیال تک بھی دل میں نہیں لانا چاہئے۔ انسان کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہر حال میں راضی برضا رہے۔ دنیا کی عیش سامانیاں اگر امیروں کے حصہ میں آئی ہیں تو اس پر افسردہ ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اس کے بعد' اخروی زندگی کی ابدی مسرتیں سب غریبوں کے حصے میں آئیں گی۔

انسان کی حالت

یہ تھا بعثت محمدیؐ کے وقت خدا کا تصور' اور اس کے تابع انسان کی حالت' اقبالؔ کے الفاظ میں اس وقت کیفیت یہ تھی کہ۔

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پاء و گردنش

کاہن و پاپاو سلطان و امیر
بہر یک نخچیر، صد نخچیر گیر!

یہ تھی انسان کی زار وزبوں حالت، جب حضور نبی اکرم ﷺ تشریف لائے۔ آپؐ آئے اور دنیا کے تمام ''خداپرستوں'' کو مخاطب کر کے یہ انقلاب آفریں اعلان فرمایا کہ خدا کا یہ تصور تمہاری اپنی مفاد پرستیوں اور چیرہ دستیوں کا تراشیدہ ہے۔ اسے حقیقی خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقی خدا وہ ہے جس نے اس کارگہ کائنات کو پیدا کیا اور پھر ہر شے کے لئے ایک اندازہ، پیمانہ اور قانون مقرر کر دیا جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتی ہے۔ خلق کل شئ فقدرہ تقدیرا۔ (25/2)۔ لہٰذا یہاں کسی متبد، مطلق العنان حاکم کی آمریت کارفرما نہیں۔ یہاں ہر کام..... قاعدے اور قانون، دستور اور آئین کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔ جسے خدا کا امر (یعنی حکم) کہا جاتا ہے وہ درحقیقت قانون ہی کا دوسرا نام ہے۔ وکان امر اللہ قدرا مقدورا (33/39) یہ قوانین غیر متبدل ہیں، اور ہر ایک پر یکساں طور پر نافذ۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (33/62)۔ یہ قوانین، خارجی کائنات میں، قوانین فطرت کی اصطلاح سے متعارف ہیں اور انسانوں کے لئے اس قسم کے غیر متبدل قوانین، وحی کی رو سے دیئے گئے ہیں جو کتاب اللہ (قرآن کریم) کے اندر محفوظ ہیں۔ خدا کا انسانوں کے ساتھ تعلق انہی قوانین کے ذریعے سے ہے۔ براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ جب کوئی شخص کتاب اللہ کر پڑھتا ہے تو خدا اس سے ہمکلام ہوتا ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو وہ خدا کے منشاء کو پورا کرتا ہے۔

قانون کی کارفرمائی

ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے خود انسانوں ہی کا بھلا ہوتا ہے، خدا کا کچھ نہیں سنورتا۔ نہ ہی ان کی خلاف ورزی سے خدا کا کچھ بگڑتا ہے۔ اس لئے خدا کے خوش یا ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان احسنتم احسنتم لا نفسکم۔ وان اساتم فلھا۔ (17/7)۔ ''اگر تم اچھے کام کرو گے تو اس کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا اور اگر غلط روش اختیار کرو گے تو اس کا نقصان بھی تم ہی اٹھاؤ گے''۔ لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ۔ (53/38) ''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا''۔

یہ واضح ہے جہاں قانون کی کارفرمائی ہو وہاں نہ کسی کی خوشامد درآمد کی ضرورت ہوتی ہے نہ رشوت اور نذرانے کی۔ وہاں نہ کسی وسیلے کی احتیاج ہوتی ہے نہ کسی سفارشی کی تلاش۔ وہاں نہ کسی سے بے انصافی ہوتی ہے نہ کسی کی رورعایت۔ وہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یقبل منھا شفاعۃ ولا یؤخذ منھا عدل ولا ھم ینصرون۔ (2/48)۔ ''وہاں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے بدلے میں اپنے آپ کو پیش کر سکے گا، نہ کسی کی سفارش کام آ سکے گی، نہ ہی کوئی شخص کچھ فدیہ (یا رشوت) دے کر چھوٹ سکے گا نہ ہی کوئی کسی دوسرے کی کسی قسم کی مدد کر سکے گا''۔ قانون کی یہی کارفرمائی تھی جس کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے، اپنی حیات دنیوی کی آخری ساعتوں میں اپنی چاہتی بیٹی، حضرت فاطمہؓ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ

فاطمہؓ! خدا کے ہاں، محمدؐ کی بیٹی ہونا تمہارے کسی کام نہیں آ سکے گا۔ وہاں صرف تمہارے اپنے اعمال کام آ سکیں گے۔

نہیں! اس سے بھی آگے بڑھئے۔ آپ ﷺ نے خود اپنے

متعلق فرمادیا کہ ان اتبع الا ما یوحیٰ الی۔ میں خود خدا کے قوانین ہی کا اتباع کرتا ہوں جو اس نے بذریعہ وحی عطا فرمائے ہیں۔انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم۔ (10/15)۔اگر میں بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کروں تو اس کا خمیازہ مجھے بھی بھگتنا پڑے گا۔اس سے مجھے بھی کوئی نہیں بچا سکے گا۔

مصیبتوں کا ذمہ دار کون ہے؟

غور فرمایا آپ نے' عزیزان گرامی قدر! کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے خدا کا کس قسم کا تصور پیش کیا اور یہ تصور عالم انسانیت میں کس قدر عظیم انقلاب کا اعلان تھا! آپ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے کھلے الفاظ میں فرمادیا کہ یاد رکھو۔ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم۔ (42/30)۔جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ خدا کی طرف سے نہیں آتی' خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ یا تو تمہاری اپنی غلط تدبیر کا نتیجہ ہوتی ہے یا اس کا ذمہ دار معاشرہ کا غلط نظام ہوتا ہے۔اگر وہ تمہاری اپنی غلط تدبیر کا نتیجہ ہے تو اس کی اصلاح خود کرو۔اور اگر وہ غلط معاشرہ کا نتیجہ ہے تو اس معاشرہ کو الٹ کر اس کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کرو۔ جو لوگ تم سے کہتے ہیں کہ یہ مصائب اور تکالیف' یہ تباہیاں اور بربادیاں خدا کی طرف سے آتی ہیں' وہ تمہیں دھوکا دے کر' تمہاری نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر دیتے ہیں تاکہ تم انہیں ذمہ دار ٹھہرا کر ان کا مواخذہ نہ کرنے لگ جاؤ۔وما ظلمھم اللہ ۔ ولٰکن انفسھم یظلمون (3/16)۔خدا کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔انسان خود ہی اپنے آپ پر زیادتی کرتے ہیں۔یاد رکھو! جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا' یہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں' یہ دھوکا دیتے ہیں۔سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اباء نا ولا حرمنا من شیء۔ یہ مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد نہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرتے' نہ ہی از خود حلال چیزوں کو حرام قرار دیتے۔ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں' یہ سب خدا کی مشیت سے ہوتا ہے۔انسان تو مجبور محض ہے' اس کی کیا مجال کہ خدا کے حکم کے بغیر کچھ کر سکے۔اس کے جواب میں کہا۔۔کذالک کذب الذین من قبلھ۔ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔اس سے پہلے بھی خود فریب قومیں اسی طرح تقدیر کے عقیدہ کو اپنی غلط کوشیوں کے لئے آڑ بنا لیا کرتی تھیں لیکن اس سے خدا کا قانون مکافات تو نہیں بدل جاتا تھا۔وہ لوگ اپنے غلط اقدامات کو مشیت خداوندی کی طرف منسوب کئے جاتے۔ حتی ذاقوا باسنا۔ (6/149) اور ان کے اعمال کے نتائج تباہیاں بن کر انہیں گھیر لیتے۔

رزق کی بست و کشاد

آپ نے غور فرمایا! برادران گرامی قدر! کہ اس اعلان نے' انسانی فکر و نظر کی دنیا میں کیسا انقلاب عظیم برپا کر دیا؟ پھر آپ ﷺ نے لوگوں سے کہا کہ یہ جو تم سے کہا جاتا ہے کہ رزق کی تنگی اور خوش حالی کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے' وہ جسے چاہے کروڑ پتی بنا دے' جسے چاہے روٹی سے بھی محتاج کر دے' تو یہ بھی ان کا فریب ہے۔یاد رکھو! رزق کی بست و کشاد کے لئے بھی خدا کے قوانین مقرر ہیں۔ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا۔ (20/124)۔جو ان قوانین سے اعراض برتتا ہے' تو اسکی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔اگر کسی معاشرہ میں حالت یہ ہے کہ

لاکھوں انسان رات کو بھوکے سوتے ہیں' اور ان کے بچے دودھ کے گھونٹ کے لئے ترستے ہیں' تو یہ کچھ خدا کی مرضی سے نہیں ہوتا' وہ معاشرہ قوانین خداوندی سے سرکشی برتتا ہے جس کا نتیجہ اس قسم کی ناہمواریاں ہوتی ہیں۔تم ان کی فریب آمیز باتوں میں نہ آؤ۔اس معاشرہ کو بدل کر' ایسا معاشرہ قائم کرو جس میں رزق کی تقسیم اللہ کے قوانین کے مطابق ہو اور امیر اور غریب کی تفریق مٹ جائے۔یاد رکھو! کوئی بچہ' نہ امیر پیدا ہوتا ہے نہ غریب۔ یہ تمہارا غلط نظام ہے جو اس قسم کی تفریق پیدا کرتا ہے۔

اور یہ جو بگلا بھگت تمہیں یہ کہہ کر تھپکیاں دیتے رہتے ہیں کہ اگر تم مفلس اور غریب ہو تو اس سے دل گرفتہ نہ ہو۔خدا کے مقرب بندوں کی یہی نشانیاں ہیں تو یہ تمہیں سخت دھوکے میں رکھتے ہیں۔ یاد رکھو! ''خوف اور بھوک خدا کا عذاب ہے۔'' (16/112) اور یہ عذاب صرف اسی دنیا تک محدود نہیں۔جس کی یہ دنیا خراب ہے۔۔اور وہ اپنی اس خرابی کو خدا کی مشیت یا اس کے مقربین کی علامت سمجھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے' اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ میں نے جو آیت ابھی ابھی پیش کی ہے یعنی ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا۔۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔۔تو اس کا باقی حصہ یہ ہے کہ و نحشرہ یوم القیمۃ اعمیٰ (20/124)۔ ہم اسے قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھائیں گے۔۔یہی وہ حقیقت ہے جسے خدا کے اس عظیم داعی انقلاب ﷺ نے ان جامع الفاظ میں بیان فرمایا کہ الفقر سواد الوجھہ فی الدارین۔ مفلسی اور محتاجی' دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں روسیاہی کا باعث ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا کہ مفلسی اور محتاجی انسان کو کفر کی حد تک لے جاتی ہے۔

علماء و مشائخ

وہ مذہبی پیشوا' جو مفاد پرست گروہوں کے ایجنٹ بن کر' عوام کو غلط عقائد کی افیون پلاتے رہتے ہیں' ان کے متعلق فرمایا کہ یاد رکھو! ان کثیرا من الاحبار و الرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ۔ یہ جو علماء و مشائخ بڑے مقدس بنے پھرتے ہیں' ان میں سے اکثریت کی یہ حالت ہے کہ یہ لوگوں کا مال حرام طور پر کھا جاتے ہیں اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں خدا کے صحیح نظام کو قائم نہ کر لیں اس لئے کہ صحیح نظام خداوندی میں ان کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ باقی رہے وہ سرمایہ دار جن کے یہ ایجنٹ ہوتے ہیں تو سن رکھو کہ والذین یکنزون الذھب و الفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ (9/34)۔ جو لوگ دولت کے ڈھیر جمع کرتے ہیں اور اسے ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے عام نہیں کرتے' ان سے کہہ دو کہ ان کی اس روش کا نتیجہ ایسی تباہی ہوگی جس سے وہ چیخ اٹھیں گے۔

حکومت

غور فرمایا آپ نے عزیزان من! ایک خدا کے تصور میں صحیح تبدیلی پیدا کر دینے سے' حضور ﷺ نے کس طرح مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کی انسانیت سوز لعنتوں کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا۔ باقی رہا نظام حکومت' تو اس کے لئے آپ نے اعلان فرما دیا کہ

ما کان لبشر ان یؤتیه اللہ الکتٰب والحکم و النبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولٰکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتٰب و بما کنتم تدرسونo(3/78)

کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین حکومت حتیٰ کہ نبوت تک بھی دے دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم قانون خداوندی کی نہیں بلکہ میری محکومی اختیار کرو۔ اسے صرف یہ کہنا چاہئے کہ اس ضابطۂ قوانین کی رو سے ربانی بن جاؤ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کی تعلیم کو تم اپنے دل پر نقش کرتے ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک اعلان سے حضورﷺ نے کس طرح حکومت کے تصور کو بنیادی طور پر بدل دیا۔۔۔ اعلان یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ حکومت صرف قانون کی ہوگی اور قانون بھی وہ جو خدا کا عطا کردہ ہو' کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کا وضع کردہ نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ آپؐ خود قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کے واحد حکمران تھے۔ لیکن حکمرانی میں کسی امتیازی شان کے پیدا نہ ہونے دینے کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ کسی نے آپؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا۔۔۔ سیدنا! اے ہمارے آقا۔۔۔ تو اس پر آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ دیکھو! تمہیں شیطان بہکا رہا ہے۔ آقا صرف خدا کی ذات ہے۔ میں تو عبداللہ کا بیٹا محمدؐ خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ آقائیت صرف ذات خداوندی کے لئے ہے اور کسی کے لئے نہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

آپؐ نے' مملکت کے ارباب بست وکشاد کے لئے حکام کے بجائے عمال کی اصطلاح رائج فرمائی جس کے معنی حکم چلانے والے نہیں بلکہ کام کرنے والے (کارندے) کے ہیں۔ ان عمال کو تملق پیشہ مصاحبوں کے نرغے سے بچانے کے لئے آپؐ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر کسی شخص نے' حاکم کو خوش کرنے کے لئے ایسی بات کہہ دی جس سے اس کا خدا ناراض ہو جائے (یعنی وہ قانون خداوندی کے خلاف ہو) تو وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔

جس معاشرہ میں' ذاتی جائیدادیں بنانے کا تصور نہ ہو اس میں رشوت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔ یہ چیزیں تو نظام سرمایہ داری کی لعنتیں ہیں۔ لیکن آپؐ نے اس باب میں بھی اتنی دور نگہی اور جز رسی سے کام لیا کہ اس فتنہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ پہلے تو یہ فرمایا کہ ''رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنمی ہیں''۔ اس کے بعد' آپ ایک قدم اور آگے بڑھے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے' آپ یہ دیکھئے کہ آج کل تو رشوت' بالکل خرید وفروخت کے حساب سے کھلے بندوں لی اور دی جاتی ہے' لیکن جب اس کا چلن عام نہیں تھا تو لوگ حکام کے ہاں تحائف پہنچاتے تھے جسے ڈالی کہا جاتا تھا۔ جس حاکم نے ڈالی رکھ لی۔ سمجھ لیا کہ اسکا پانی مرتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ تحائف سے رشوت تک پہنچ گئے۔ حضورؐ نبی اکرم کی نگہ بصیرت اس فتنہ کے سرچشمہ کو بھانپ رہی تھی۔ ایک مرتبہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ حکومت کے واجبات ہیں جو میں نے لوگوں سے وصول کئے ہیں اور یہ ایک تحفہ ہے جو انہوں نے مجھے ذاتی طور پر دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب تم عامل نہیں

تھے اور اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تھے تو کیا یہ لوگ اس وقت بھی تمہیں تحائف بھیجتے تھے۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپؐ نے فرمایا کہ پھر یہ تحفہ نہیں' رشوت ہے۔ اسے بیت المال میں داخل کرو اور آئندہ کبھی تحائف قبول نہ کرو۔ آپنے غور فرمایا' عزیزان من! کہ حضورؐ نے دوستداری کے ذاتی تعلقات اور سرکاری ملازموں کے ساتھ تعلقات میں کیسا لطیف لیکن نہایت عمیق خط امتیاز کھینچا ہے۔ دوستوں سے تبادلۂ تحائف کی آپ نے ترغیب دلائی تھی کہ اس سے باہمی تعلقات میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے لیکن جب کسی سرکاری ملازم کو تحفہ دیا جاتا ہے تو وہ دوستداری کے تعلقات کی بناء پر نہیں ہوتا۔ وہ' اس سے تعلقات پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے تاکہ اس سے آگے چل کر کچھ مفاد حاصل کئے جائیں۔ یہی ہیں وہ تحائف جو رشوت کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے آپؐ نے ان سے بھی روک دیا۔

رسول کی حیثیت

اب ہمارے سامنے' عزیزان من! اس مرحلہ کا نازک ترین گوشہ آتا ہے۔ آپ دنیائے مذاہب پر ایک نظر ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے اپنے مذہب کے بانی کو انسانی سطح سے اٹھا کر' فوق البشر حیثیت دے دی۔ کہیں اسے خدا کا اوتار بنایا گیا' کہیں خدا کا بیٹا' کہیں خود خدا۔ لیکن حضورؐ نے اپنے متعلق اعلان فرما دیا۔۔ اور ایک بار نہیں' بار بار یہ اعلان کیا کہ۔۔۔ انما انا بشر مثلکم ۔۔۔ سن رکھو کہ میری حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ میں خود تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔۔ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اور جب میں اس وحی کو تم تک پہنچا دیتا ہوں تو پھر مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ مجھے کوئی فوق الفطرت قوت حاصل نہیں۔۔ لا املک لنفسی ضرا ولا نفعا۔ (10/49)۔ دوسرے تو ایک طرف' مجھے خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں۔ میں غیب کی باتوں کو بھی نہیں جانتا۔۔ لا اعلم الغیب (11/31)۔۔ تم مجھ سے معجزات طلب کرتے ہو کہ وہ اس بات کی شہادت بنیں کہ میں اپنے دعوائے رسالت میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ سنو کہ میرا معجزہ کیا ہے۔

فقد لبثت فیکن عمرا من قبلہ۔ افلا تعقلون۔ (10/16)۔

میں نے اس سے پہلے اپنی ساری عمر تمہارے درمیان گذاری ہے۔ تم ذرا عقل وفکر سے کام لے کر سوچو کہ اس قسم کی زندگی کسی جھوٹے اور فریب کار کی ہوتی ہے یا سچے اور راستباز انسان کی؟

یہ ہے میرے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت' اور میرا معجزہ۔۔۔ وہ معجزہ جو تم میں سے بھی ہر ایک دکھا سکتا ہے۔

ختم نبوت

مذہب کی دنیا میں کسی رسول کا یہ اعلان ہی کچھ کم انقلاب انگیز نہ تھا کہ وہ اور انسانوں جیسا ایک انسان ہے' اور (وحی کے علاوہ) اس نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے وہ ایک انسان کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس لئے اسے' ہر وہ انسان کر کے دکھا سکتا ہے جو وحی خداوندی کا اتباع کرے۔ لیکن آپؐ ایک قدم اور آگے بڑھے اور ایک اعلان ایسا فرمایا جو اس سے پہلے نہ کہیں دیکھا تھا نہ سنا۔ اور جو مذہب کی دنیا میں بڑا ہی محیر العقول اور خارق عادت تھا اور وہ اعلان یہ تھا کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اب کوئی آ کر یہ بات بھی نہیں کہہ سکے گا کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اس لئے تم میری وحی کا

اتباع کرو۔ خدا کی طرف سے جو کچھ ملنا تھا وہ مل چکا اور اس کی کتاب میں محفوظ کر دیا گیا۔ اب دنیا کے کسی انسان کے لئے اتنی سی فوق الفطرت خصوصیت کی گنجائش بھی نہ رہی کہ اسے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔۔۔ نہ ہی کسی انسان کے لئے اس کا حق باقی رہا کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنی بات خدا کی وحی کہہ کر منوائے۔ اس سے انسان کو کس قدر فکری اور قلبی آزادی نصیب ہوتی ہے' اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔۔۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؔ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

> اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان' جو ایشیائے قبل از اسلام کی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے' اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت) کے اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دور حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے اور (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔
> (خطباتِ اقبالؔ)

خدا کی طرف سے مکمل راہنمائی اس کی کتاب کے اندر محفوظ شکل میں موجود ہے۔ اب مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ اس راہنمائی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے' اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل' باہمی مشاورت سے' غور و فکر اور علم و بصیرت کی رو سے تلاش کریں۔ اب لوگوں کو کسی خاص شخصیت کی طرف آنکھیں لگا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں کہ جو فیصلہ وہاں سے ملے اس پر عمل کیا جائے۔ اب شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا' اور اسے ختم یہ کہہ کر کیا گیا کہ کائنات کی عظیم ترین شخصیت خود محمدؐ رسول اللہ کی ہے۔ لیکن سن رکھو کہ۔

> وما محمد الا رسول۔ قد خلت من قبلہ الرسل۔ افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ..... (3/143)
>
> محمدؐ بھی اس کے سوا کچھ نہیں' کہ خدا کے ایک پیغام بر ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے پیغام بر' اپنی اپنی باری آئے اور دنیا سے چلے گئے۔ سو کیا جب یہ کل کو مر جائیں' یا قتل کر دیئے جائیں تو تم (یہ کہہ کر) الٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے (کہ بات تو ساری محمدؐ کی ذات سے تھی۔ جب وہ نہیں رہے تو معاملہ ختم ہو گیا)۔

عقل کا مقام

نہیں! اب بات شخصیتوں پر منحصر نہیں رہی۔ اب دور اصولوں کی حکمرانی کا آ گیا ہے۔ وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے کام لینا' یہ ہے ختم نبوت کا عملی مفہوم۔ اور یہاں سے ہمارے سامنے ایک اور عظیم انقلاب کا اشارہ سامنے آتا ہے۔۔ ''مذہب میں عقل کا دخل نہیں''۔ اسے دنیا کے ہر مذہب میں بطور مسلمہ تسلیم کیا جاتا تھا (اور کیا جاتا ہے) حضور نبی اکرمؐ نے بتایا کہ انسانی زندگی میں عقل کو بڑا بلند مقام حاصل ہے۔ جو کچھ میں عرض کرنے لگا ہوں اسے' برادران عزیز! غور سے سنئے گا۔

> حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اُمّ المومنین! ایک شخص رات کو زیادہ سوتا ہے اور کم

عبادت کرتا ہے اور دوسرا زیادہ عبادت کرتا ہے اور کم سوتا ہے۔ آپ کے نزدیک دونوں میں سے کونسا زیادہ پسندیدہ ہے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے ایسا ہی سوال رسولؐ اللہ سے کیا تھا تو آپؐ نے جواب دیا تھا کہ ان میں سے جو زیادہ عقلمند ہے وہ۔ میں نے عرض کیا۔ یارسولؐ اللہ! میں نے تو ان کی عبادت کے متعلق پوچھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے عائشہؓ! ان کی عقلوں کے متعلق سوال ہوگا۔ پھر جو شخص زیادہ عقلمند ہوگا وہی دنیا اور آخرت میں افضل ہوگا۔ (کتاب الازکیا۔ ابن جوزی)۔

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں' عزیزان من! کیا مذہب کے سارے لٹریچر میں آپ کو کہیں اور بھی اس قسم کا انقلاب انگیز اعلان ملتا ہے؟ یا اس قسم کا اعلان کہ

مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔ (ترمذی)۔

عبادت اور اخلاق

حضورﷺ کے زمانے میں دو صحابیؓ بیبیاں تھیں۔ ایک رات بھر نمازیں پڑھتیں' دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ خیرات بھی بہت کرتیں۔ مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا ناک میں دم کئے رکھتیں۔ دوسری بی بی صرف فرض نماز پڑھتیں اور تھوڑا بہت خیرات کا کام کرتیں' مگر کسی کو اذیت نہ پہنچاتیں۔ آپﷺ سے ان دونوں کے متعلق پوچھا گیا تو آپؐ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ اس میں کوئی نیکی نہیں۔ وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ وہ جنتی ہو گی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی بات بتاؤں جو روزہ' نماز اور زکوٰۃ سے بھی درجہ میں افضل ہے۔ صحابہؓ نے بڑے اشتیاق سے دریافت فرمایا تو آپؐ نے کہا کہ

باہمی تعلقات کا درست رکھنا۔ 2

حتیٰ کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ

اپنے کسی بھائی کو دیکھ کر خوشی سے مسکرانا بھی نیکی ہے۔

مذہب کی دنیا میں وہ لوگ بڑے خدا رسیدہ اور مقرب بارگاہ خداوندی سمجھے جاتے ہیں جو اپنی عبادت میں شدت اختیار کریں۔ لیکن خدا کے اس داعیٔ انقلابؐ نے' اس باب میں بھی ایسے فیصلے دیئے جو مذہب کے اس مسلمہ کے خلاف چیلنج تھے۔ ایک صحابیؓ حضرت عقبہ کی بہن نے منت مانی کہ وہ پیدل حج کرے گی۔ حضرت عقبہؓ نے آ کر حضورؐ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنی بہن سے کہو کہ اللہ کو اس کی اس نذر کی حاجت نہیں۔ معمول کے مطابق سواری پر حج کرنے جائے۔ ایک دفعہ آپؐ نے دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپؐ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ فلاں شخص ہے اور اس نے منت مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا' بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا' اور نہ بات کرے گا اور مسلسل روزے رکھتا رہے گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس سے کہو کہ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہے ہو۔ باتیں کرو' سایہ میں بیٹھو اور معمول کے مطابق روزہ پورا کرو۔ 1

اور روزوں کے متعلق حضرت انسؓ کی وہ روایت بڑی اہم ہے جس میں انہوں نے بتایا کہ ہم رسولؐ اللہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ بعضوں نے ہم میں سے روزہ رکھا اور بعض نے نہیں رکھا۔ ہم نے ایک جگہ قیام کیا۔ جن لوگوں نے روزہ رکھا تھا وہ نڈھال ہو کر آرام کرنے لگے اور جن کا روزہ

1 ادب المفرد۔ امام بخاری۔ 2 ابوداؤد۔

1 ابوداؤد۔

نہیں تھا وہ اپنے کاموں میں مصروف رہے۔ چنانچہ انہوں نے خیمے کھڑے کئے اور اونٹوں کو پانی پلایا۔ رسولؐ اللہ نے دیکھ کر فرمایا کہ آج وہ لوگ جنہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا' سارا ثواب لوٹ کر لے گئے۔ 1

یہ' اور اس قسم کے اور ارشادات' جن میں معاملات کو عبادات پر ترجیح دی گئی ہے' درحقیقت قرآن کریم کے اس اعلان عظیم کی تفسیر و تشریح ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق و المغرب۔ ولٰکن البر من امن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ و الکتٰب و النبیین۔ و اتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ و الیتٰمٰی و المسٰکین و ابن السبیل و السائلین و فی الرقاب.....(2/177)۔

نیکی اور کشادگی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی اور کشادگی کی راہ اس کی ہے جو خدا' آخرت' ملائکہ' کتب اور انبیاء پر ایمان لانے کے بعد مال کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔۔ یعنی اپنے ضرورت مند اقرباء کو' معاشرہ میں تنہا رہ جانے والوں کو۔ ان کو جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ نادار مسافروں کو' حاجتمندوں کو اور انہیں جو دوسروں کی محکومی میں ہوں.....۔

معاشیات

آپ نے غور فرمایا کہ مذہبی رسمیات (Formalism) کے مقابلہ میں' معاشی معاملات کے حل کرنے کی اہمیت کو کس بلیغ انداز میں سامنے لایا گیا ہے؟ یہ وہ انقلابی آواز تھی جس کی اہمیت آج' چودہ سو سال بعد' ہمارے زمانے میں ابھر کر سامنے آ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں حضورﷺ نے چند الفاظ میں جس بنیادی اصول کو بیان فرمایا' جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ فرمایا کہ۔

جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)۔

یعنی اس بستی میں کتنے ہی نمازی' کتنے ہی پرہیز گار' کتنے ہی عبادت گزار کیوں نہ ہوں' اگر اس میں ایک فرد بھی بھوکا سو گیا ہے تو اس بستی کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ عزیزان من! سوچئے کہ معاشیات کی دنیا میں اس سے بڑھ کر انقلاب آفریں اصول کوئی اور بھی ہو سکتا ہے!

آپ نے یہ اصول بیان فرمایا اور پھر ایک عملی پروگرام کے مطابق' اسے حقیقت میں تبدیل کر کے دکھا دیا۔ حضورؐ کی مکی زندگی' اس پروگرام کے ابتدائی مراحل پر مشتمل تھی۔ اس میں آپؐ نے کیا طریق اختیار کیا' اسے سمجھنے کے لئے' حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اس روایت کو سامنے لائیے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ

اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا' یا ان کے بال بچوں پر ویسے ہی فاقے کی نوبت آ جاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیتے اور پھر اس کے برابر حصے کر کے آپس میں بانٹ لیتے۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں

1 مشکوٰۃ۔

ان میں سے ہوں۔ (صحیحین)

یوں آپؐ نے اس معاشی پروگرام کی ابتداء فرمائی اور رفتہ رفتہ ایک جماعت کی تشکیل کی جس میں' اپنی ضرورت سے زائد کسی کے پاس کچھ نہیں رہتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت ہے کہ

ہم رسولؐ اللہ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس سواری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اسے اس آدمی کو دے دے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِراہ زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِراہ نہ ہو۔ اسی طرح آپ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔ (مسلم)

اور یہ عملی تفسیر تھی اس ارشاد خداوندی کی جس میں کہا گیا ہے کہ یسئلونک ماذا ینفقون ۔اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے عام کردیں۔ قل العفو (2/219)۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہو' سب کا سب۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ

بندہ' میرا مال میرا مال کہتا ہے' حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ (۱) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے۔ (۲) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے۔ (۳) اور جو کچھ وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے یا وہ دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ (مسلم)۔

اور اس اصول پر آپ نے خود اس طرح عمل کر کے دکھایا کہ ضرورت سے زائد کبھی ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ نہ ہی کوئی جائدادیں کھڑی کیں' نہ ہی کوئی ترکہ چھوڑا۔

زمینداری کا نظام

اس زمانے میں ابھی کارخانہ داری کا نظام وجود میں نہیں آیا تھا۔ آمدنی کا سرچشمہ زمین تھی۔ اور زمین کے متعلق آپؐ نے یہ انقلاب آفریں اعلان فرمادیا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین' اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔ (ابوداؤد)

غور کیجئے' برادران عزیز! کہ اس ایک اعلان نے کس طرح جاگیرداری اور زمینداری کے نظام باطل کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اس اصول کی عملی تفسیر کے لئے آپ نے فرمادیا کہ ''جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی تو خود کاشت سے زائد زمین کو بٹائی یا پٹہ پر دینا قطعاً ناجائز ہے''۔ (مسلم)۔

آج عزیزان من! اس سوال نے بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے یا سرمایہ کا۔ خدا کے اس داعیٔ انقلابؐ نے' آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس سوال کا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ (53/39)۔ معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ سرمایہ کے معاوضہ کو ربوٰ کہا جاتا ہے اور ربوٰ حرام ہے۔ جو لوگ اس قسم کا معاشی نظام قائم کرنا چاہیں' انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ''خدا اور رسولؐ'' کے خلاف اعلان جنگ ہوگا (2/277)۔ جیسا کہ

میں نے ابھی ابھی کہا ہے' یہ آواز آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے بلند ہوئی۔۔۔اس وقت دنیا نے اس پر دھیان نہ دیا اور جاگیرداری اور سرمایہ پرستی کے انسانیت کش نظام کو مسلک زندگی بنائے رکھا۔لیکن اب زمانے کے تقاضے انسان کو مار مار کر اس طرف لا رہے ہیں۔مگر (جیسا کہ تاریخ انسانیت میں شروع سے ہوتا چلا آ رہا ہے) خدا کے باطل تصور کا حامل مذہب پرست طبقہ اس کے راستے میں روک بن کر کھڑا ہے۔یہ وجہ ہے کہ جو قومیں اس نظام کو اختیار کرنا چاہتی ہیں' وہ اس کے سوا چارہ نہیں دیکھتیں کہ وہ مذہب پرست طبقہ کے پیش کردہ خدا کو جھٹک کر الگ کر دیں۔لیکن خدا کے نام پر اس انقلاب کی دعوت کا سہرا' عالمگیر انسانیت کے اس محسن اعظمؐ کے سر ہے جس نے ''الکاسب حبیب اللہ'' کا نعرہ بلند کر کے' محنت کو عبادت کا مقام عطا کر دیا۔

پھر حضورؐ نے ان لوگوں کو' جو غریبوں کو ضروریات زندگی سے محروم رکھتے ہیں' وارننگ دے دی کہ یاد رکھو! اگر تم نے ایسا نظام قائم کیا جس میں امیر' امیر تر۔۔اور غریب' غریب تر ہوتا جائے' تو اس کا انجام بڑا خطرناک ہوگا۔سنئے' کہ اس حقیقت کبریٰ کو آپؐ نے (آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے) کیسی بلیغ مثال میں پیش کیا۔فرمایا کہ۔

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا' ہم نیچے کشتی میں سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔مگر انہیں پانی دے کر اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں۔(ترمذی)۔

سوچئے' عزیزان من! کہ اس سے بڑا انقلاب انگیز اعلان کوئی اور بھی ہوسکتا ہے!

☆☆☆

یہ ہیں برادران گرامی قدر! اس عالمگیر انقلاب کے چند گوشے' جسے جہان فکر و عمل میں حضور نبی اکرمؐ نے برپا کیا۔ اس انقلاب کے بے شمار گوشے اور بھی ہیں لیکن اتنا وقت نہیں کہ میں انہیں بھی آپ کے سامنے پیش کر سکوں' اس لئے میں سردست اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔لیکن' اس سلسلہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور اعلان آپ کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھا ہے اور حضورؐ کا یہ وہ اعلان عظیم ہے جو تمام اسلامی تعلیم کا ماحصل ہے اور جس کی نظیر کم از کم میری نظروں سے کہیں نہیں گزری۔ آپؐ نے پوری انسانیت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یاد رکھو!

من استویٰ یوماہ فھو مغبون

جس شخص یا جس قوم کے دو دن ایک جیسے گزر گئے۔یعنی جس کا آج اس کے گزشتہ کل کی نسبت ایک قدم آگے نہ بڑھا' وہ سخت نقصان میں رہا۔

غور فرمائیے برادران عزیز! کیا اتنے کم لفظوں میں اس قسم کا انقلاب آفریں اعلان آپ کی نظروں سے کہیں اور بھی گزرا ہے؟ اور جو حقیقت اس میں بیان کی گئی ہے ایسی عظیم اور عمیق حقیقت کوئی اور بھی ہوسکتی ہے؟

بہرحال' حضورؐ کی تعلیم اور سیرت کے جو چند گوشے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں' آپ ان پر غور کیجئے اور سوچئے کہ اگر ہم سیرت کی تقریبات پر انقلاب محمدیؐ کے ان

گوشوں کو دنیا کے سامنے لائیں، تو ہماری یہ محفلیں، کس طرح ایک جہانِ نو کی تشکیل کا سامان فراہم کر دیں، اور دنیا کس طرح، نوع انسان کے اس محسن اعظمؐ کی بارگاہ عظمت مآب میں بصد عقیدت و احترام ہدیہ تبریک و تحسین پیش کرنے کے لئے بہ ہمہ ذوق وشوق آگے بڑھے۔۔یعنی دنیائے انسانیت کے اس محسن اعظمؐ کے حضور جس نے مردہ بستیوں میں صور اسرافیل پھونکا اور اس طرح (اقبالؒ کے الفاظ میں)

شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد
کوہکن را پایۂ پرویز داد

قوتِ او ہر کہن پیکر شکست
نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید
بندہ را باز از خداوندان خرید

ہزار ہزار سلام و رحمت ہو آسمانی انقلاب کے اس داعئ مبینﷺ پر جس نے زندگی کو ایک نیا خواب اور اس خواب کو ایک نئی تعبیر عطا کر کے کائنات کو اس قدر حسین اور زندگی کو ایسا پیارا بنا دیا۔

والسلام!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ وہ واحد مکرم ہستی ہیں کہ جن کی آمد نے ضرورت نبوت کو پورا کر دیا ہے۔ اب آپؐ کے بعد اصولاً کسی نئی پرانی نبوت کی احتیاج ہی باقی نہیں رہی' اس لئے کہ قرآن مجید کی صورت میں جس ضابطہ حیات کو آپؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں کسی نوع کا اضافہ ممکن نہیں۔ یہ پیغام ہر لحاظ سے مکمل ہے بالکل اسی طرح جیسے آپؐ کی ذات ایک اکمل ذات ہے کہ بنی نوع انسان میں ایک بھی شخصیت کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی جو مدارج میں آپ ﷺ سے بڑھی ہوئی ہو۔

صاحبو! ایک فرد سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے آخر اربوں لوگوں میں ایک بندے کو ایسی بے مثل فضیلت کیسے حاصل ہوگئی جس کا اعتراف اپنوں نے تو کرنا ہی کرنا ہے انصاف دوست غیروں نے بھی غیر مبہم الفاظ میں بے حد فیاضی کے ساتھ آپ ﷺ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ہماری نظر میں اس سوال کا بڑا ہی واضح جواب موجود ہے۔ جی ہاں آپؐ کی عظمت کا راز یہ ہے کہ آپؐ ایک پریکٹیکل انسان تھے ایسے باعمل انسان جس کی مثال تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔ آپؐ جو کہتے تھے' وہی کرتے تھے۔ آپؐ کے قول اور عمل میں بُعد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دنیا میں بڑے بڑے فلاسفرز' مفکر' ریفارمرز آئے ہیں' اپنی اپنی بساط کے مطابق بڑے ہی پرکشش نظریات انہوں نے پیش کئے' بڑے مربوط اور عمدہ نظام انہوں نے متعارف کروائے لیکن ان کی اپنی ذوات یہ شہادت فراہم کرنے سے ایک حد تک قاصر ہیں کہ اپنی پیش کش پر انہیں بھی اتنا ہی پختہ ایمان تھا جس کا تقاضا یا توقع وہ اپنے ماننے والوں سے کرتے تھے۔ خود ان کی نجی زندگیاں گواہی دیتی ہیں کہ اپنی آئیڈیالوجی کے اولین ''کافر'' بھی وہ خود ہی ثابت ہوئے۔ ایک نبی اور غیر نبی میں یہی فرق ہوتا ہے کہ نبی اپنے پر نازل ہونے والی شے کا پہلا مومن آپ خود ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ سبب بڑا ہی لطیف ہے کہ نبی پر جو کچھ اترتا ہے وہ اس کی اپنی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ کسی اور ذریعے سے یہ انعام اسے عطا ہوتا ہے۔ ہاں پھر اس ارمغان کو وہ طرفۃ العین میں حرزِ جان بنالیتا ہے۔ اس کے بعد وہ عمر بھر ایک آن بھی اس آسمانی تحفے سے جدا نہیں ہوتا۔ تشکیک وارتیاب کی چیونٹیاں اس کی ذات کی وادی سے گزر نہیں سکتیں۔ اس کی یہی Conviction درحقیقت اس کے ذوق عمل کا منبع اور توانائی کا مصدر ہوتی ہے۔

سلسلہ انبیاء و رسل کے آخری فرد ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ بھی مذکورہ ایقان کی مجسم برہان ہیں۔ آپ ﷺ کی جسمانی حیات مبارکہ کا زمانہ کافی مختصر ہے۔ شمسی کیلنڈر کے مطابق یہی کوئی اکسٹھ برس۔ یوں تو آپؐ کی پوری زندگی فروغ زیست ایسے عظیم مقصود کے لئے برابر وقف رہی لیکن آپؐ کی جدوجہد کا بھرپور زمانہ وہ دو دہائیاں ہیں جب آپؐ نے بحیثیت رسول اپنے فرائض رسالت کی ادائیگی میں دن رات ایک کر دیا۔ ایسی آہن گداز محنت' ایسی جانگسل کاوش کہ آرام کی گھڑی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اپنے ساتھیوں کی اخلاقی تربیت سے لے کر جنگ کے میدانوں تک ایک غازی' ایک مجاہد کی طرح مسلسل برسرپیکار۔ صدیوں کے بگڑے عربوں کو سدھارنا بھلا کوئی سہل کام تھا' لیکن آپؐ نے ایک سے بڑھ کر ایک تندخو کو ایسا شائستہ اور مہذب انسان بنا دیا کہ دیکھنے والے کو یقین نہیں آتا تھا کہ یوں بھی کسی کی 'قلب ماہیت' ہوسکتی ہے۔ پھر آپ ﷺ کی دعوت پر منکرین قوانین خداوندی نے جس شدید ترین ردعمل کا اظہار کیا ہے' وہ داستان سن کر پتھر کا جگر بھی پانی ہو جاتا ہے۔ ایسے متحدہ محاذ کا مقابلہ نہایت مضبوط اعصابی قوت سے ہی ممکن تھا' سو آپؐ ان اتحادیوں کے سامنے اپنے چند ساتھیوں کے جلو میں پوری شوکت کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ لے دے کہ یہی کوئی بیس ایک برس گزرتے ہیں کہ وہ نظام جس کی تعمیر میں سینکڑوں برس خرچ ہوئے تھے' جس کے قد و قامت کو سب سے بڑے بت کا مقام حاصل تھا' دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ہی قدموں میں نہ صرف ڈھیر ہو گیا بلکہ اس کے ملبے کے اوپر قلیل ترین مدت میں حکومت الٰہیہ کی عمارت استوار کر کے دکھا دی۔ ایسا Revolution' چشم تماشا آج تلک متحیر ہے۔ اچھا قرآن مجید میں ایک جگہ آپ ﷺ کو **یاایھا المدثر** کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے جس کا عام طور پر ترجمہ ''اے کپڑے میں لپٹنے والے'' کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک صاحب علم نے اس کی نہایت وجد آفریں وضاحت کی ہے۔ ان کے بقول الدثر' مال کثیر یا ہر کثیر شے کو بھی کہتے ہیں۔ مال دثر' بہت زیادہ مال۔ **ھود ثر مال**' وہ اونٹوں کی اچھی خبر گیری کرنے والا ہے۔ **تدثر الرجل فرسہ**' آدمی اپنے گھوڑے پر اچھل کر سوار ہو گیا۔ یہ چیز اچھل کر' اچک کر بتدریج نہیں ہوتی بلکہ یک لخت ہوتی ہے۔ جو انقلاب نبی اکرمؐ کے مبارک ہاتھوں سے رونما ہوا اس کا طریق Revolutionary تھا۔ یعنی انقلاب کا دفعتاً رونما ہو جانا۔ اسکے بعد اب قرآنی تصورات حیات کا بتدریج غلبہ ہو رہا ہے' اسے Evolutionary طریق کہتے ہیں۔ اس پس منظر میں **یاایھا المدثر** کا بڑا ہی ایمان افروز مفہوم یوں بیان کیا ہے' اے وہ کہ جس کے ذمے عالم انسانیت کو سنوار کر ایک جہان نو کو وجود میں لانے اور اس طرح حق کے نظام کو ہر نظام باطل پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو آپ ﷺ کی ذات گرامی قدر ایک غیر معمولی فعال ہستی کے روپ میں سامنے آتی ہے جبکہ موجودہ امت مسلمہ کی انفعالیت پسندی (Passivity) تو کسی اور ہی نقشے کو پیش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور غالباً نہیں واقعتاً ہمارے زوال کا حقیقی سبب بھی یہی ہے کہ ہمیں مزاج خانقاہی میں پختہ تر کر دینے کے خوگر ذکرو

فکر صبحگاہی میں مصروف رکھے ہوئے ہیں۔ ایک التباس ہے جسے تخلیق کر دیا گیا ہے کہ فلاں تسبیح سے ملت بیضا کو غلبہ حاصل ہو جائے گا' فلاں وظیفے سے رزق میں بے پایاں برکتیں پڑ جائیں گی۔ مسکینی و دلگیری سکھانے والا فقر تو ہماری میراث نہیں' وہ ضرب کلیمی کیا ہوئی جس نے جہانگیری و جہانبانی ہمارا 'مقدر' بنائی تھی۔ اب ان افکار عمیق کی کہیں کوئی جھلک دکھائی دیتی ہے' نہ اس لذتِ کردار کا نظارہ آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ نہ وہ جلال باقی ہے نہ وہ جمال جلوہ افروز ہے۔ شیخ کلیسا نواز شبانہ روز اسی تعلیم کو عام فرمانے کا ''جہاد'' کر رہے ہیں کہ ترک جہاد ہی میں کل سلامتیوں کا عرق موجود ہے۔ سوائے غلامو! اس آب حیات کے ایک قطرے سے شفاؤں کی اپسرائیں قیامت تک تمہارے آنگنوں میں رقص کرتی رہیں گے۔ کوئی اس بے توفیق فقیہہ حرم سے پوچھے کہ ذکر نیم شبی' مراقبوں اور اپنے ہی قلوب پر لگانے والی ضربوں سے کیا درِ خیبر اکھڑا تھا؟ عصائے موسوی کے بغیر تو کلیمی بھی کار بے بنیاد سمجھی گئی ہے۔ مجاہدانہ حرارت سے تہی قوموں کی تقدیر تو بجز غلامی کی ذلتوں کے اور کچھ بھی نہیں۔ مستیٔ احوال اور مستیٔ گفتار کا اچار ڈالنا ہے' مستیٔ کردار کے بغیر تو اس زوال سے نجات نہیں مل سکتی۔ ہمیں تو سکوں پرست جمود دوست (در پردہ) فرعون کے مرید اور حرکت بیزار راہبوں کے عدو اقبالؔ اور اقبال مندوں نے محولہ نکات کی تائید میں یہ گر کی بات سمجھائی ہے ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانا

اور آخر میں کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری قوم کو صرف یہ یاد دلانا ہے کہ آج کے دن وہ برگزیدہ ہستی دنیا میں آئی تھی جس کا نصب العین حیات غلامی کی زنجیروں کو توڑنا تھا اور اس مقدس وجود نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اس مجاہد اعظم رسول ﷺ کے امتی ہیں' کیا ہمیں یہ اِدّعا زیبا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر فتح محمد ملک

مسلمانوں کا گناہ

امام کعبہ کا خطبۂ حج سن کر مجھے علامہ اقبالؒ کی آخری نظموں میں سے ایک نظم بے ساختہ یاد آئی۔ اس نظم کا عنوان ہے ''ندائے غیب'' اور اس میں اللہ میاں مسلمانوں سے اس گناہ کا حساب مانگ رہے ہیں جو ان سے مسلسل سرزد ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ گناہ اسلام میں عبادت کے اس تصور سے روگردانی کا گناہ ہے جو ''وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل'' یعنی تسخیرِ کائنات سے عبارت ہے۔ اس گناہ کی پاداش میں بقول اقبال مسلمان ''مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے''۔ اقبال کی اس نظم کی رو سے اللہ میاں مسلمانوں سے روزانہ صبح کے وقت اس غفلت کی باز پرس کرتے ہیں۔ اس نظم کے ابتدائی چار شعر کیا ہیں چند آتشیں سوالات ہیں۔ آیئے ان سوالات سے آنکھیں چار کریں:

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟

امام کعبہ کے تازہ ترین خطبۂ حج کو اگر مسلمان دانشوروں کی حالیہ ملائیشیا کانفرنس کی کہانی سے ملا کر پڑھا جائے تو نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ مسلمان (شعلہ) خس و خاشاک (مغربی استبداد) کی غلامی پر نازاں ہے۔ مسلمان جس گناہ کی پاداش میں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئے ہیں وہ جدید اور سائنسی علوم میں پسماندگی کا گناہ ہے۔ المیہ یہ ہے کہ عرشِ بریں سے ہر صبح سنائی دینے والی جو ''ندائے غیب'' اقبال کو بے چین کر دیا کرتی تھی اس پر مسلمان تو آج تک کان نہیں دھر رہے مگر دنیائے اسلام کی ممکنہ بیداری سے خائف مغربی دنیا اس آواز کو بڑے غور سے سنتی چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ مغرب بڑے انہماک کے ساتھ مسلمانوں کو جدید اور سائنسی علوم سے بے بہرہ رکھنے کے اہتمام میں مصروف ہے۔ انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے قیام کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کا جوہرِ ادراک بدستور گم رہے' ان کا نشترِ تحقیق کند کا کند اور زنگ آلود کا زنگ آلود ہی رہے اور وہ فطرت کی تسخیر کی بجائے مظاہرِ فطرت سے بدستور ڈرتے کانپتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایجنسی وہاں

ہلاکت آفریں ہتھیار تلاش کرنے میں مصروف ہے جہاں یہ ہتھیار موجود نہیں ہیں اور وہاں تلاش نہیں کرتی جہاں ان ہلاکت آفرین ہتھیاروں کے انبار لگے ہیں۔ ان ہتھیاروں کی تلاش کے نام پر عراق کی تو اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی مگر اسرائیل میں یہ ایجنسی فقط اس لئے داخل نہیں ہوتی کہ اسے بخوبی علم ہے کہ وہاں یہ ہتھیار موجود ہیں۔ عراق کی تباہی پر کمر بستہ قوتوں کو اس بات کا اطمینان تھا کہ عراق کے پاس ہلاکت آفریں ہتھیار نہیں ہیں مگر وہ اس بات پر پریشان تھے کہ اگر آج عراق کو تباہ نہ کر دیا گیا تو کل وہ ویسے ہی تباہ کن ہتھیار بنا لے گا جو اسرائیل کے پاس موجود ہیں اور یوں ایک عرب ملک ممکنہ اسرائیلی جارحیت کا دفاع کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے پھانسی کی کوٹھڑی میں بیٹھے یہ سوال اٹھایا تھا کہ جو ایٹمی ہتھیار عیسائی تہذیب' ہندو تہذیب اور یہودی تہذیب کے وابستگان کے پاس موجود ہیں وہ اسلامی تہذیب کے وارثوں کے پاس کیوں نہ ہوں؟..... آج یہ سوال پوری دنیائے اسلام میں کراں تا کراں گونج رہا ہے۔

بات یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک کی طرح مسلمان ممالک کو بھی اپنے دفاع کا حق حاصل ہے۔ پاکستان کے پاس بھی ہر وہ ہتھیار ہونا چاہئے جو بھارت کے پاس موجود ہے۔ پاکستان کو بھی ہر اس دفاعی ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل ہونی چاہئے جس پر بھارت کو حاصل ہے۔ اسی طرح سے عرب اور عجم کے ان تمام ممالک کو بھی وہ دفاعی ٹیکنالوجی میسر آنی چاہئے جو ان کے ناراض ہمسایہ اسرائیل کو میسر ہے۔ مغربی دنیا مسلمان ممالک کے اس بنیادی حق سے انکاری ہے۔ چنانچہ کل عراق کو اپنے دفاع کے اس حق سے محروم کرنے کی خاطر تباہ کر دیا گیا اور آج ایران' پاکستان اور مصر کو اس حق سے محروم کرنے کی حکمت عملی پر عمل کی راہوں کی تلاش زوروں پر ہے۔ صدام حسین کی حکومت کا تختہ اس لئے نہیں الٹا گیا کہ وہ ایک آمر مطلق تھے۔ دنیائے اسلام میں آمروں کی قوت کے سرچشمے تو وائٹ ہاؤس اور پینٹا گان میں رواں ہیں۔ صدام حسین کی بجائے عراق کی تباہی کی بنیادی وجہ تو عراق کے نظام تعلیم و تربیت کو تباہ کر کے عراق میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا انفراسٹرکچر برباد کرنا تھا' سو وہ کر دیا گیا۔

تین ماہ پیشتر قاہرہ میں عراق کی رواں صورت حال پر ایک سیمینار میں اس حقیت کو بے نقاب کیا گیا کہ گذشتہ برس کے دوران اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کے کارندوں نے تین سو دس عراقی سائنسدانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس سیمینار میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی لیبارٹریوں کی تباہی اور سائنسدانوں کی ہلاکت سے متعلق الاہرام ریسرچ سنٹر کی تیار کردہ ایک رپورٹ بھی پیش کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں پہلی بار یہ انکشاف کیا گیا کہ امریکہ نے پہلے ہلے ہی میں 70 عراقی سائنسدانوں کو عراق سے اٹھا کر کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ:

"There is a joint American and Israeli plan to kill as many Iraqi scientists as possible. The Iraqi ambassador in Cairo, Ahmad Al-Iraqi, accused Isreal of sending a 'commando unit' to Iraq immediately after the US invasion, which killed Iraqi scientists. Israel has played a

prominent role in liquidating Iraqi scientists... The campaign is part of a Zionist plan to kill Arab and Muslim scientists working in apllied research which Israel sees as threatening its interests."

اسرائیل اور امریکہ کی درج بالا سرگرمیاں صرف عراق تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا دائرہ مصر، پاکستان اور ایران تک پھیلا ہوا ہے۔ فرانسیسی خبر رساں ایجنسی ای ایف پی کے مطابق ایران نے حال ہی میں اسرائیل اور امریکہ کے لئے نیوکلیئر جاسوسی میں مصروف دس افراد کو گرفتار کیا ہے۔ آج جب امریکہ مسلمان ممالک کو نیوکلیئر سائنس کے علوم سے دور رکھنے کی خاطر مسلح جارحیت کی دھمکیاں دینے میں مصروف ہے خود اسرائیل کا نامور نیوکلیئر ٹیکنالوجسٹ ونونو اسرائیل کو ایران سے بڑا خطرہ قرار دے رہا ہے۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں ونونو نے سویڈش پبلک ریڈیو پر اپنے انٹرویو میں مطالبہ کیا ہے کہ انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی ایران سے پہلے اسرائیل کے ایٹمی اسلحہ خانے کی سیر کرے۔ ونونو اسرائیل کا وہ منحرف اسرائیلی نیوکلیئر ٹیکنیشن ہے جس نے بیس برس پہلے 1986ء میں برطانوی اخبار دی سنڈے ٹائمز میں مطبوعہ اپنے انٹرویو میں یہ انکشاف کیا تھا کہ ڈی مونا نیوکلیئر ویپنز پلانٹ میں اسرائیل نے ہلاکت آفریں ایٹمی ہتھیاروں کے انبار لگا رکھے ہیں۔ تب سے لے کے اب تک انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اسرائیل میں ہلاکت آفریں ہتھیاروں کا سراغ ڈھونڈنے نکلے۔ ونونو ہی نے سب سے پہلے امریکہ اور اسرائیل کے نیوکلیئر اشتراکِ عمل کے بین ثبوت پیش کئے تھے۔ آج اسرائیل اور بھارت کا نیوکلیئر اشتراک اور تعاون کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں بھارت کے اسی (80) نیوکلیئر سائنسدانوں کی ایک ٹیم تل ابیب سے ہو کر آئی ہے۔ اس صورتحال میں مسلمان دانشوروں پر لازم آتا ہے کہ وہ اس سوال پر غور کریں کہ جو عمل عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کے ہاں خیر ہے وہ مسلمانوں کے ہاں شر کیسے ہو کر رہ گیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

قرآنی نظام کیسے قائم ہوگا؟

(ماخوذ)

طلوع اسلام میں ۔۔قرآن کی رو سے ذاتی ملکیت' کے موضوع پر بصیرت افروز اور حقائق پرور مقالات شائع ہوتے رہے ہیں' اس کے متعلق ہمیں بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ان میں بہ ہیئت مجموعی جو سوال سامنے لایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کا قرآنی نظام معیشت' جس میں ذاتی ملکیت باقی نہیں رہتی' بحالات موجودہ عمل میں کیسے لایا جا سکے گا؟ سوال بڑا اہم ہے۔اس لئے' اسی نسبت سے گہری توجہ کا مستحق۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کا سیاسی نظام ہو یا معاشی' معاشرتی ہو یا عدالتی ان میں سے کوئی بھی اپنی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا۔اسلام' انسانی زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت قرار دیتا ہے۔اور چونکہ اس کا (یعنی اسلام کا) تعلق انسانی زندگی سے ہے' اس لئے اس کا نظام بھی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے جس کے مختلف شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پانی' ہائیڈروجن اور آکسیجن کے مرکب ہی کا نام ہوتا ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ ہائیڈروجن کو الگ سلنڈر میں بھر لیں اور اسے ایک حصہ پانی قرار دے لیں اور آکسیجن کو دوسرے سیلنڈر میں بھر کر اسے دو حصے پانی کہہ دیں۔ جب تک آپ ان دونوں کو ان کی خاص نسبت اور خاص قاعدہ کے مطابق یکجا نہیں کریں گے اسے پانی نہیں کہا جا سکے گا۔ یہی کیفیت اسلامی نظام کی ہے۔اس کے الگ الگ حصے کر کے' انہیں اسلامی نظام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ انسان' نہ تو اس کے سر کا نام ہے' نہ دل کا' نہ جگر کا نہ پھیپھڑوں کا۔حتیٰ کہ نہ خون کا نہ سانس کا۔انسان' بتمامہٖ انسان ہے' اور یہ تمام اجزاء انسانی زندگی کے اسباب و ذرائع ہیں۔ یہی کیفیت اسلامی نظام حیات کی ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ یہ ہماری حقیقت فراموشی اور کوتاہ نگہی ہے کہ نظام زندگی خواہ کسی قسم کا ہو' ہم نماز پڑھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کے ایک حصہ پر عمل کر لیا اور زکوٰۃ دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کے دوسرے حصے پر عمل پیرا ہو گئے۔ یہ اسلامی نظام حیات کے ارکان ہیں اور اس نظام کی عدم موجودگی میں ان کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے مردہ کے جسم کے اعضاء و جوارح۔

یہ جو ہمارے ہاں آئے دن مطالبہ ہوتا رہتا ہے کہ

مختلف جرائم کی شرعی سزائیں دینی چاہئیں تاکہ یہاں اسلامی نظام رائج ہو جائے' تو یہ بھی اسلامی نظام کی حقیقت و ماہیت سے بے خبری کی دلیل ہے۔۔قرآن کا معاشری نظام کوئی ایسا خود مکتفی عنصر نہیں کہ اسے رائج کرنے سے ہم یہ سمجھ لیں کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہو گیا ہے' یا اسے اسلام کے مجموعی نظام سے الگ کر کے نافذ کیا جا سکے۔

یہ غلط نگہی ہمارے قدامت پسند' مذہبی طبقہ تک ہی محدود نہیں جو لوگ اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے ہیں' ان کے ذہن میں بھی یہی ہے کہ کمیونزم ایک معاشی نظام ہے اور بس۔ اگر وسائل پیداوار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر' اجتماعی ملکیت میں دے دیا جائے تو اسے کمیونزم کہا جائے گا۔ یہ بھی یکسر غلط ہے اور کمیونزم کی اصل و حقیقت سے بے خبری کی دلیل۔ کمیونزم ایک فلسفۂ زندگی۔۔ایک منفرد آئیڈیالوجی۔۔ہے۔ اور اس آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے جس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وسائل پیداوار انفرادی ملکیت میں نہیں رہتے۔ اگر اس معاشی نظام کو اس آئیڈیالوجی سے الگ کر دیا جائے' تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا۔

ضمناً' اس سے یہ بھی واضح ہے کہ محض اس قدر مشترک ہونے کی بنا پر کہ اسلام کے معاشی نظام میں بھی وسائل پیداوار پر ذاتی ملکیت نہیں رہتی اور یہی صورت کمیونزم میں ہوتی ہے' اسلام اور کمیونزم ایک نہیں ہو جاتے۔ اسلام کا فلسفۂ حیات' اور کمیونزم کا فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

بہرحال' ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کا معاشی نظام کوئی ایسا خود مکتفی شعبہ نہیں جسے اسلام کے پورے نظام سے الگ کر کے نافذ کیا جا سکے۔ جب کسی معاشرہ میں قرآنی نظام زندگی نافذ ہوگا تو اس کا لازمی نتیجہ وہ معاشی نظام ہوگا جس میں وسائل پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوگی۔

لہٰذا' اصل سوال یہ ہے کہ جن حالات میں سے ہم گزر رہے ہیں (یا ہمارے معاشرہ کی جو موجودہ حالت ہے') اس میں قرآنی نظام زندگی کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے؟

جب نبی اکرم ﷺ نے دنیا کے سامنے اسلامی نظام کو پیش کیا' تو اس وقت دنیا میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔۔۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ اس نظام کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔ جو شخص' دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے بعد' اسے اپنے لئے قابل قبول سمجھتا' وہ اسے اختیار کر لیتا۔ ایسا کرتے وقت وہ اچھی طرح جانتا کہ اس میں ذاتی ملکیت باقی نہیں رہے گی۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان حضرات پر مشتمل ایک سوسائٹی وجود میں آ گئی جو قرآنی نظام زندگی کو بطیب خاطر اپنے لئے نظام حیات قرار دے چکے تھے۔ لہٰذا' ان کی صورت میں کرنے کا کام فقط اتنا تھا کہ باہمی مشاورت سے یہ سوچ اور طے کر لیا جائے کہ معاشرہ کے اس وقت کے حالات کے مطابق' اس نظام کو کس طرح عملاً وجود میں لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے انقلابی پروگرام کو بتدریج ہی انتہا تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے لئے یہی طریق کار اختیار کیا گیا اور اس کے لئے خود قرآن میں رہنمائی موجود تھی۔ یہ جو ہم قرآن کریم میں صدقہ خیرات' قرض حسنہ' وراثت وغیرہ سے متعلق احکام و ہدایات دیکھتے ہیں' وہ اسی عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں

اس نظام کو تدریجاً اس کی آخری منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس کے تکمیل تک پہنچ جانے کے بعد' نہ اس معاشرہ میں کوئی محتاج و محروم رہ سکتا ہے جس کے لئے صدقہ و خیرات کی ضرورت پیش آئے' نہ ہی کوئی صاحبِ جائیداد ہوسکتا ہے جس کا اس قسم کا ترکہ اس کے پسماندگان میں تقسیم ہو۔ اس انقلاب کے داعی (رسول اللہ ﷺ) کی اپنی زندگی' شروع ہی سے اس انتہائی منزل کی آئینہ دار تھی۔۔۔ اور اسے ایسا ہونا بھی چاہئے تھا' کیونکہ اسے تو ہمیشہ تک کے لئے دوسروں کے لئے اسوۂ حسنہ (ماڈل) بننا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ حضور ﷺ نے دولت جمع کی' نہ جائیدادیں کھڑی کیں۔ نہ زندگی میں کچھ پس انداز کیا' نہ وفات کے بعد کچھ ترکہ میں چھوڑا۔

ضمناً۔۔۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامی حضرات (بڑی جرأت سے) کہہ دیتے ہیں کہ فلاں صحابیؓ کے پاس اس قدر دولت تھی اور فلاں کے پاس اس قدر خزانے۔۔ ان حضرات سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہئے اور وہ یہ کہ آپ' ایک نقشہ رسولؐ اللہ کی زندگی کا پیش کرتے ہیں اور اس کے بالکل برعکس' دوسرا نقشہ' ان صحابہؓ کا۔ اب آپ یہ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں سے کون سا نقشہ اسلام کی صحیح تعبیر کہلا سکتا ہے؟[1] رسولؐ اللہ کی زندگی کا نقشہ یا ان حضراتؓ کی زندگی کا (وہ نقشہ) جسے آپ پیش کرتے ہیں۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ حضرات ان دونوں نقشوں کو عین مطابق اسلام قرار دیں گے! اور (صرف) ان دو نقشوں پر ہی کیا موقوف ہے' ان کے پیش کردہ تصور کی رو سے تو ہر قسم کے متضاد اور باہمدگر متخالف و متبائن نظریات و تصورات (بلکہ ان کی عملی شکلیں بھی) سب اسلام ہیں! ان کے تصور اسلام کی رو سے حضرت ابوذر غفاریؓ کا مسلک (جو جمع کردہ دولت کو جہنم کی آگ قرار دیتے تھے) بھی عین مطابق اسلام تھا' اور حضرت عثمانؓ کا مسلک بھی (جن کے پاس بقول ان کے' دولت کے انبار در انبار تھے) عین اسلامی۔ ان کے نزدیک' مسلمان سلاطین کے حق میں خلد اللہ ملکہ اور ایدہ اللہ بنصرہ کی مقدس دعائیں کرنے والے علماء کرام بھی ''رحمہم اللہ تعالیٰ'' ہیں اور ملوکیت کو ابلیسی نظام قرار دینے والے بھی ''رحمہم اللہ تعالیٰ''۔ ان کے اسلام کی رو سے' موجودات عالم کو عین ذات خداوندی سمجھنے والے بھی ''شیخ اکبر'' کہلانے کے مستحق ہیں' اور ان کی تردید میں عمر بھر جہاد کرنے والے بھی ''مجدد اعظم''۔ ان میں سے ہر فرقہ' دوسرے فرقے پر کفر کے فتوے بھی لگاتا ہے' اور پھر ان تمام فرقوں کے مجموعہ کا نام امت محمدیہ بھی قرار دیتا ہے۔ سو جن کے اسلام کی یہ حالت ہو' وہ اگر رسول اللہ ﷺ کے نقش حیات اور ان کے بالکل برعکس' مسلک زندگی کو عین مطابق اسلام قرار دے لیں تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے؟

بہرحال' ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآنی نظام کے داعیٔ اول (حضور نبی اکرم ﷺ) نے جس سوسائٹی کو متشکل فرمایا۔ اس کا ہر ممبر اس اقرار کے ساتھ اس سوسائٹی میں داخل ہوا تھا کہ وہ قرآنی نظام کے تابع زندگی بسر کرے گا۔ لہٰذا' وہاں سوال صرف طریق کار کا تھا۔ لیکن ہماری حالت ان سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ایک سوسائٹی پہلے سے موجود ہے جو اپنے

1. واضح رہے کہ ہمارے نزدیک تاریخ کے ایسے واقعات جو صحابہؓ کی زندگی کو قرآنی تعلیم یا رسولؐ اللہ کی زندگی سے مختلف ثابت کرتے ہیں' وضعی اور ناقابلِ اعتبار۔ ہمارا ایمان ہے کہ رسولؐ اللہ کی زندگی قرآن کے مطابق اور صحابہؓ کی زندگی رسولؐ اللہ کی زندگی کے مطابق تھی۔

آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی شخص بھی قرآنی نظام کو سمجھ کر' اس یقین و ایمان کے ساتھ اس سوسائٹی کا ممبر نہیں بنا کہ وہ اس نظام کو اپنے اوپر عملاً وارد کرنے' اور پھر اسے دنیا میں عام کرنے کے لئے' اس سوسائٹی میں شامل ہو رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں' جس اسلام کی طرف وہ اپنی نسبت کرتا ہے' اس کے سامنے اس کا بھی کوئی متعین مفہوم نہیں۔۔۔ یہ بھی اسلام ہے اور وہ بھی اسلام۔۔۔ اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جس نظریہ کا ایک' واحد' متعین اور منفرد مفہوم نہ ہو' بلکہ کہا یہ جائے کہ یہ مفہوم بھی صحیح ہے اور وہ مفہوم بھی صحیح۔۔۔ اس پر کسی کا مستحکم یقین نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے جب (خدا کے ماننے والوں کے متعلق) کہا تھا کہ فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا۔ (اگر یہ خدا کو اس تصور کے مطابق مانیں جو تمہارا تصور ہے تو پھر یہ سمجھا جائے گا کہ وہ صحیح راستے پر ہیں) تو اس سے یہی مقصود تھا۔۔۔ سبل متفرقہ (مختلف راستوں) کو یکساں ماننے والوں کو قرآن ایمان والے قرار ہی نہیں دیتا (6/154)۔ اسلام' جب ایک نظریۂ حیات اور ضابطۂ زندگی ہے' تو اس کا مفہوم بھی ایک اور صرف ایک ہو سکتا ہے۔ ''مذہب'' چونکہ انفرادی چیز ہوتا ہے اس لئے اس میں اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا کہ ایک شخص نے اس کا کوئی مفہوم لے لیا اور دوسرے نے کوئی اور۔ لیکن دین تو اجتماعی نظام حیات کا نام ہے اس لئے اس میں مختلف مفاہیم لینے کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ جو ہر مسلمان کے لئے حکم ہے کہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو' وہ اپنا ''رخ جانب قبلہ رکھے'' تو اس کا عملی مفہوم یہی تھا کہ دنیا کے ہر مسلمان کا نصب العین حیات ایک ہونا چاہئے۔ اسی کا نام توحید ہے اور یہی وجہ ہے قرآن نے' فرقہ بندی کو بالفاظِ صریح شرک قرار دیا ہے۔ (30/31)۔

لہٰذا' موجودہ مسلمانوں کی پہلی مشکل تو یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو سمجھ سوچ کر' بہ طیب خاطر' بطور نظام حیات قبول نہیں کیا۔

اور ان کی دوسری دشواری یہ ہے کہ جس اسلام کی طرف یہ اپنی نسبت کرتے ہیں' اس کا کوئی ایک متعین مفہوم ان کے سامنے نہیں۔

اور تیسری دشواری یہ ہے (اور یہ سب سے اہم اور بنیادی دشواری ہے) کہ بہ ہیئت مجموعی' اسلام کا جو تصور' ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے' اسے اس اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں جسے خدا نے اپنے رسول ﷺ کی وساطت سے عطا فرمایا تھا۔۔۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ نظام سرمایہ داری کو مسلمانوں کے تمام مذہبی فرقے عین اسلام قرار دیتے ہیں اور اسلام میں فرقوں کے وجود کو کوئی بھی شرک تسلیم نہیں کرتا! حالانکہ یہ دونوں چیزیں اسلام کی یکسر نقیض ہیں۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ

اسلامی نظام کا واضح مفہوم متعین کیا جائے۔۔۔۔۔

ایک متعین مفہوم۔

یہ کام مذہبی پیشوائیت کے بس کا نہیں۔ ہماری مذہبی پیشوائیت' فرقہ بندی کا شکار ہے اور فرقہ بندی میں (قرآن

کے الفاظ میں) ہوتا یہ ہے کہ کل حزب بما لدیھم فرحون (30/31)۔ ہر فرقہ اپنے مسلک کو حق سمجھتا ہے اور اپنے عقائد میں ایسا مست ہوتا ہے کہ (اس کے خلاف کسی نظریہ کو حق سمجھنا تو درکنار) وہ اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنا بھی کفر و الحاد کے مرادف سمجھتا ہے۔۔۔ فرقہ بندی قائم ہی اس قسم کی متشدد عصبیت سے رہ سکتی ہے۔۔۔ جو حضرات' ہزار برس سے یہ نہ طے کر سکے کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہئے یا نیچی سے' کیا وہ پورے کے پورے اسلامی نظام کا ایک متفق علیہ مفہوم متعین کر سکیں گے؟ ان سے ایسی توقع رکھنا خود فریبی ہے۔ گذشتہ دنوں امریکہ کے سابق وزیر خارجہ کا ایک انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا جس میں پوچھا گیا کہ کیا امریکہ کو اس وقت سخت خطرہ لاحق نہیں ہو جائے گا جب پاکستان میں حقیقی اسلامی نظام نافذ ہو جائے گا۔ سابق امریکی وزیر نے نہایت اطمینان سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس کا کوئی امکان نہیں کیونکہ ہر فرقہ کی فقہ اور اسلام کی تعبیر مختلف ہے یہ عملاً ناممکنات میں سے ہے لہٰذا امریکہ کو پاکستان سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

ہمارے نزدیک یہ کام مملکت کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلام میں نہ دین و دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور نہ ہی انسانی زندگی کو مختلف خانوں (Compartments) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا' اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امت کی پوری کی پوری زندگی کے متعلق ضوابط مقرر کرے۔ ظاہر ہے کہ مملکت کی طرف سے متعین کردہ ضابطہ قوانین ساری قوم کے لئے ایک ہی ہو سکتا ہے۔۔۔ اس میں' دین و دنیا کی تفریق تو ایک طرف' شخصی اور پبلک لاز کی تفریق بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔۔۔ یعنی اسلامی نظام کا مفہوم متعین کر کے اسے ملک میں عملاً نافذ کرنا۔

مذہبی پیشوائیت تو ایسا کر نہیں سکتی تھی اس لئے اس نے نہ اب تک ایسا کیا' نہ ہی ایسا وہ کبھی کر سکے گی۔ لیکن ہمارے ہاں کی مملکت نے' ایسا کر سکنے کے باوجود' ایسا نہ کیا۔

لیکن کسی نے ایسا کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کے بغیر نہ مملکت اسلامی بن سکتی ہے' نہ موجودہ مسلمان' مسلمان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اسلامی نظام کا مفہوم متعین کرنے کے بعد' اگلا مرحلہ یہ ہوگا کہ اس مفہوم کو دلائل و براہین کی رو سے سمجھایا جائے۔ اور نہایت محبت اور شفقت سے مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے ان سے کہا جائے کہ وہ اس پر اچھی طرح سے غور و فکر کر لیں' سمجھ سوچ لیں اور اس کے بعد اس کا فیصلہ کر لیں کہ وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرنا چاہیں تو پھر ہمیں اسلام کے احیاء کا خیال چھوڑ دینا چاہئے اور اگر وہ اس پر رضامند ہوں تو پھر یہ ہوگی وہ سوسائٹی جو بیٹھ کر سوچے گی اور اس کا فیصلہ کرے گی کہ اس نظام کو اس کی آخری منزل تک لے جانے کے لئے تدریجی پروگرام کیا بنایا جائے۔ واضح رہے کہ ان کا نصب العین تو وہی ہوگا جو مفہوم انہوں نے اسلامی نظام کا متعین کیا تھا۔ سوال صرف اس نصب العین تک پہنچنے کے عملی وسائل و ذرائع اور طرق و اسالیب کا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ مملکت اس قسم کا مفہوم کس طرح

متعین کرے گی اور اس کے صحیح ہونے کا معیار کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب خدا نے خود اپنی کتاب میں دے دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

(۱) جو اپنے معاملات کے فیصلے اس کتاب کے مطابق، جسے خدا نے نازل کیا ہے، نہیں کرتے، وہ مسلمان نہیں، کافر ہیں۔(5/44)۔

(۲) اس کتاب میں کوئی اختلافی بات نہیں۔(4/82)

(۳) یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔(6/116)

(۴) یہ سمجھنے کے لئے بڑی آسان ہے۔(54/40)

(۵) یہ حرفاً حرفاً محفوظ ہے۔(15/9)

سوچئے کہ جس کتاب کا یہ دعویٰ ہو، اس سے (اس قوم کے لئے جو اس کے ان دعاوی کے سچا ہونے پر ایمان رکھتی ہو) اسلامی نظام کا واحد مفہوم متعین کر لینا کچھ بھی مشکل ہے؟ ہوسکتا ہے کہ ابتدائی کوشش میں، اس میں جزئی طور پر کوئی سقم رہ جائے، لیکن مزید غور و خوض سے وہ بآسانی رفع ہوسکتا ہے۔ بنیادی چیز تو قرآن کو بطور معیار تسلیم کرنا ہے۔ ایک غیر متبدل معیار کی موجودگی میں کسی سہو و خطا کی تصویب چنداں مشکل نہیں ہوتی اور جب وہ معیار ایسا ہو جس میں کوئی بات اختلافی نہ ہو، تو یہ بھی ناممکن ہے کہ اس سے دو متضاد معاشی نظاموں کا جواز نکل آئے۔

یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق، قرآنی نظام پاکستان میں نافذ کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کے نفاذ کے طریق میں بھی، کمیونزم اور قرآنی نظام میں، کس قدر بنیادی فرق ہے۔ کمیونسٹ اپنے نظام کو قوت کے ذریعے مسلط کرتے ہیں، لیکن قرآن کا اعلان ہے کہ دین (نظام زندگی) کے باب میں کسی قسم کا جبر و اکراہ جائز نہیں (2/256) یہ بہ طیب خاطر قبول کرنے اور دل و دماغ کے کامل اطمینان سے قائم رکھنے کی چیز ہے۔ اور (منجملہ دیگر امور) یہ بھی ایک وجہ ہے کہ کمیونزم کا نظام بزور مسلط تو کیا جا سکتا ہے، آگے نہیں چلایا جا سکتا۔ خود ہماری تاریخ میں بھی یہی ہوا جس معاشرہ نے اسے سمجھ سوچ کر بطیب خاطر قبول اور اختیار کیا تھا، اس نے اسے نہایت عمدگی سے چلایا۔ لیکن اس کے بعد جو لوگ، محض میدان جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد، اس سوسائٹی میں شامل ہو گئے، وہ اسے آگے نہ چلا سکے۔ فاتح قوم (مسلمانوں) نے ان لوگوں سے اسلام، بزور شمشیر نہیں منوایا تھا۔ اسے انہوں نے از خود اختیار کیا تھا لیکن اسے اختیار سمجھ سوچ کر نہیں کیا تھا بلکہ فاتح قوم کی عظمت و شوکت کو دیکھ کر، ان کی تقلید میں اسے اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح اسلام قبول کر لینے اور سمجھ سوچ کر قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد ایمان لانے میں یہی فرق تھا جس کے پیش نظر قرآن کریم نے ان صحرانشین عربوں کے متعلق۔۔۔ جو اسلامی مملکت کی شان و شوکت کو دیکھ کر، اسلام لے آئے تھے۔۔۔ واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ''ان سے کہہ دو کہ یہ، یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، صرف یہ کہیں کہ ہم اس مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں۔ کیونکہ ابھی تک ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ (49/14)۔ قرآنی نظام صرف اس سوسائٹی کے ہاتھوں قائم ہوسکتا ہے ''جس کے دل کی گہرائیوں میں ایمان اتر چکا ہو۔''

اور اس کا طریق یہ ہے کہ اس سوسائٹی کی ہر نئی نسل کی تعلیم اس نہج سے کی جائے کہ وہ اس نظام کی صداقت کو دلائل و براہین کی رو سے اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیں۔ اگر انکی تعلیم و تربیت کا سلسلہ اس طرح جاری رکھا جائے' تو پھر یہ قوم اس نظام کو نہایت عمدگی سے چلاتی جائے گی۔

یہ ہے ہماری بصیرت کے مطابق وہ طریق جس سے ہم قرآنی نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی تبدیلی ناممکن ہے تو پھر ہمیں' نہایت دیانتداری سے' اسلامی نظام کا نام لینا چھوڑ دینا چاہئے۔ ہم جس انداز سے اس وقت اسلامی نظام کی ''مہارنی'' پکار کر رہے ہیں۔ اس نظام سے مذاق ہے اور جو کچھ ''اسلام کے لئے'' کر رہے ہیں' اس سے اسلام اور زیادہ' نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ موجودہ اسلام' بالعموم ہمارے دورِ ملوکیت' جاگیرداری اور سرمایہ داری کا وضع کردہ ہے' اس لئے اس کی تقویت کے لئے سامان بہم پہنچانا' خلاف اسلام نظریات و مسالک کی پرورش کرنا ہے۔ یہ ہمارے مکتب' مدرسے' دارالعلوم' یہ اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کے نصاب' یا دوسری طرف یہ اسلامی مشاورتی کونسلیں اور تحقیقاتی ادارے'۔۔ غرضیکہ خدمت اسلام کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے' یہ اگر اسلام کے نام سے ابلہ فریبی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ اور اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ خود فریبی سے حقائق نہیں بدل جایا کرتے۔ آپ کتنی ہی نیک نیتی سے ببول کے پیڑ کی آبیاری اور نشوونما کرتے رہیں' اس سے انگوروں کے خوشے حاصل نہیں ہوسکیں گے۔ اگر آپ انگور حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ببول کے پیڑ کو جڑ سے اکھیڑ کر اس کی جگہ انگور کی بیل کاشت کریں۔ یہ ہے سنت اللہ۔ ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا۔ (سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوا کرتی) اسی لئے اقبالؔ نے احیاء اسلام کے لئے تعمیر نو (Re-Construction) کا تصور دیا تھا' اس کی موجودہ عمارت میں رنگ و روغن کا نہیں' اور اس تعمیر نو کا معیار یہ دیا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

نقطۂ نظر

(متفرق شذرات)

سچ آکھیاں بھانبڑ مچدا

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خبردار فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ اس سے نجات کیسے ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے جس میں تمہارے درمیان (حرام وحلال یا اطاعت وگناہ وغیرہ کا) حکم ہے اور حق و باطل کے اندر قول فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا ہلاک کرے گا اس کو اللہ اور جس نے قرآن کے سوا کسی دوسری چیز میں ہدایت طلب کی گمراہ کرے اس کو اللہ۔ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا اس کو سیدھی راہ دکھادی گئی۔ ترمذی کی حدیث نمبر 171 میں عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، سب کے سب جہنمی ہوں گے سوائے ایک کے۔ لوگوں نے عرض کی وہ کونسا؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں اور میرے ساتھ۔۔۔ کیونکہ محمد رسول اللہ والذین معہ نہ شیعہ تھے نہ سنی اور نہ دیوبندی یا بریلوی۔ صحیح بخاری جلد 4 کی حدیث نمبر 803 میں رسول اللہ ﷺ نے فرقوں سے دور رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرقہ بندی سے منع فرمایا ہے (3/102-104)۔ کیونکہ فرقہ بندی شرک ہے (30/31-32)۔ اور شرک ظلمِ عظیم ہے (31/13)۔ شرک اختیار کرنے سے کوئی چیز اپنے مقام پر نہیں رہتی۔ قرآن کی رو سے حقیقت یہ ہے کہ جب مسلم قوم شیعہ اور سنی دو فرقوں میں بٹ گئی تو اس کا رسولؐ سے کوئی واسطہ نہ رہا (6/160)۔ جب رسولؐ سے Concern نہ رہا تو اللہ اور اس کی نازل کردہ کتاب سے تعلق کیسا؟ کیسی عجیب بات ہے کہ آج ایک بھی امتی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ اس کا حضورؐ سے وہ تعلق نہیں جو ہونا چاہئے۔ تو پھر خدا کے وعدہ کے برعکس، ذلت و رسوائی، ادبار۔ انحطاط، یہ زوال کیوں؟ اس تلخ سوال کا تلخ جواب یہی ہے کہ موجودہ دور میں عقیدت کی سطح تک تو ہر مسلمان بزعم خویش حضورؐ سے منسوب ہے اور اس نسبت پر وہ فاخر بھی ہے لیکن ایمان کے لحاظ سے اکثریت اپنے نبیؐ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ کیا یہ بات بلا دلیل ہے؟ نہیں، ہمارے اعمال شاہد ہیں کہ ''امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں'' (اقبالؒ)۔ ہم ذاتی حیثیت میں سنت نبیؐ کے کس حد تک پیروکار ہیں؟ ہمارا اجتماعی نظام خلافت علیٰ منہاج رسالت سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے؟ یہ سوالات ہیں تو بڑے کڑوے مگر حقیقت سے کیسے

آنکھیں چرائیں؟ جب سچائی سامنے آتی ہے تو تلووں سے لگی سر میں سے نکل گئی کے مصداق ہم سخت برافروختہ ہو کر مارنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں' لیکن اپنے فکر وعمل پر نظر ثانی کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہوتے۔ دور جاہلیت کی شخصیت پرستی کی روش کو ابدی طور پر ختم کرنے کے لئے ختم نبوت کا اعلان کیا گیا (33/40)۔ باقی رہا فریضۂ ''رسالت''، یعنی خدا کے احکام کو لوگوں تک پہنچانا اور ان کے مطابق ایک نظام قائم کرنا' سو اسے امت محمدیہ کو کتاب اللہ کا وارث ٹھہرا کر اس کے سپرد کر دیا اور اس کا طریقہ یہ بتایا کہ اے جماعت مومنین! تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کو خود بھی اپنے سامنے رکھو اور ان کا چرچا بھی کرو اور ان کی عملی تنفیذ کے لئے دن رات سرگرداں رہو۔ اگر تم ایسا کرتے رہے تو قوانین خداوندی کی برکات اور اس کی کائناتی قوتوں کی تائید ونصرت تمہارے ساتھ رہے گی (33/41-43)۔ ان کی طرف سے تم پر تبریک وتہنیت کے پھول برسیں گے اور اس کا عملاً نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمہیں زندگی کی ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر جگمگاتی روشنی میں لے آئے گا اور تمہاری تمام صلاحیتوں کی نشوونما کرتا چلا جائے گا۔ (33/41-43)۔ یہ تھا ہم مسلمانوں کے لئے عملی پروگرام۔ اور ختم نبوت کے یہ معنی بھی ہیں کہ امت کی ہدایت کے لئے اب کوئی مامور من اللہ نہیں آئے گا۔ امت کو اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نظام کی رو سے باہمی مشاورت سے طے کرنے ہوں گے (42/38)۔ ہم نے جب شخصیت پرستی کا اجرا (یا احیاء کیا) تو مامور من اللہ کا تصور ہمارے تحت الشعور میں کروٹیں لینے لگا اس کے لئے ہم نے ہر صدی پر (مامور من اللہ) مجدد کا عقیدہ وضع کیا۔ وحی کے قائم مقام کشف اور الہام کا نظریہ مستعار لیا۔ آخری صدی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور امام مہدی کی آمد کا عقیدہ وضع کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہمارے ہاں یہ تمام عقائد بھی مسلم ہیں اور ختم نبوت پر ایمان بھی اپنی جگہ قائم۔ تحفظ ختم نبوت کانفرنس سجانے والے' مدعی نبوت کے خلاف مناظرہ کرنے والے وہ علما ہوتے ہیں جو کشف والہام۔ مجدد۔ نزول عیسیٰ اور آمد مہدی کے عقیدہ سے نبوت کی کھڑکی کھلی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ خلفشار کس بات کا نتیجہ ہے؟ نظام خداوندی کے باقی نہ رہنے کا۔ ہمارے زمانہ میں اسلامی نظام قائم کرنے کا بڑا چرچا ہے لیکن اس اسلام کے قیام کے داعی کون لوگ ہیں؟ وہی جو شخصیتوں کو سند اور حجت تسلیم کرتے ہیں اور اپنے اس عقیدہ میں ذرا سی ترمیم بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ کو معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہے!۔

دوقومی نظریہ کیا ہے؟

جناب ایڈیٹر صاحب میں آپ کے توسط سے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مملکت پاکستان کی اساس دوقومی نظریہ ہے جسے عام سوچ کے برعکس نہ تو تحریک پاکستان کے دوران وضع کیا گیا اور نہ ہی یہ نظریہ ہماری ہنگامی یا سیاسی مصلحتوں کی پیداوار ہے۔ یہ قرآن کریم کی پیش کردہ ابدی حقیقت ہے جسے اسلام کی غایت اور دین کی اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے مشرقی پاکستان کے علیحدگی اختیار کر کے بنگلہ دیش بن جانے پر ایک ہندو عورت' اندرا گاندھی کے کہنے سے دوقومی نظریہ کالعدم قرار پا کر ختم نہیں ہو جاتا۔ کوئی مانے یا نہ مانے یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے دوقومی نظریہ کو دین کے اصل الاصول کے طور پر سورۃ التغابن کی آیت نمبر ۲ میں محفوظ کر رکھا ہے۔ جب فرمایا ''(اللہ) وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن'' گویا قرآن کریم کی

رو سے تفریق انسانیت کا یہی معیار ہے جس کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں۔ مومن اور کافر یا مسلم اور غیر مسلم' سورۃ الکہف میں ہے کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے' یہ ضابطۂ ہدایت آ گیا ہے اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کر لے۔ نوح علیہ السلام کے اپنے بیٹے اور حضور نبی کریم ﷺ کے چچا ابوجہل وغیرہ کا ایمان نہ لانے کی وجہ سے ایک ہی ملک میں رہنے کے باوجود قوم کافرین میں شمار ہو گیا۔ خلفائے راشدین کے دور تک قومیت کا یہی معیار رہا' لیکن جب دین کو مذہب اور ملوکیت کے دو شعبوں میں بدلا گیا تو پھر مسلمان نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے۔ صدیوں تک ہماری یہی حالت رہی کہ ہم میں مفکر قرآن علامہ اقبالؒ پیدا ہوئے جنہوں نے دین اور مذہب کے فرق کی طرح یہ بھولا ہوا سبق بھی از سر نو یاد دلایا کہ امت محمدیہ کا نسلوں اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا اسلامی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ پوری امت' ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر امت واحدہ ہے اس لئے ہم مسلمان دنیا کے تمام مسلم اور غیر مسلم ممالک میں رہنے کے باوجود ایک قوم کے افراد اور بھائی بھائی ہیں۔ تحریک پاکستان کے دوران قائداعظمؒ اور گاندھی و نیشنلسٹ علما کے درمیان یہی نزاع تھی۔ وہ کہتے تھے ''قومیت'' وطن کے اشتراک سے ہے۔ قائداعظم کہتے تھے ''نہیں'' مسلمان اور ہندو الگ الگ دو قومیں ہیں۔ ہمارے ہاں وارثان منبر و محراب اور چند عاقبت نااندیش پارٹی لیڈر نہ تو تحریک پاکستان کے دوران یہ حقیقت جانتے تھے نہ ہی اب تک اساس پاکستان کو نقصان پہنچانے کی خاطر سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان کے برعکس 1941ء میں کٹر ہندو منشی رام نے لدھیانہ کے اکھنڈ بھارت جلسہ میں یہ واضح کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے۔ نہیں جانتے تو سن لو کہ اس کا مطلب ہے کہ ایک ایسا خطہ زمین جس میں دو قومی نظریہ کے تحت قرآنی حکومت قائم کی جائے گی۔'' اہل مغرب بھی جانتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں یہی وجہ ہے جب نواز شریف حکومت نے ایٹم بم دھماکہ کیا تو انہوں نے اسے اسلامک بم کا نام دیا۔

فرمودات قائداعظمؒ

میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے' البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے' اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں' زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی ہو یا معاشی غرض یہ کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد' 1941ء)۔ آپ نے مجھ سے ایک پیغام کی خواہش کی ہے' میں بھلا آپ کو کیا پیغام دے سکتا ہوں' روشنی اور راہنمائی کے لئے تو ہم سب قرآن کے عظیم ترین پیغام سے فیضیاب ہیں (فرنٹیئر مسلم اسٹوڈنٹس' 14 اپریل 1943ء)۔ اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے' یہ ضابطہ حیات' مذہب' معاشرت' تجارت' عدل' فوج' سول' فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے' مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات' روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا' اجتماعی واجبات کا سوال ہو یا انفرادی' حقوق کا' اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا

ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہئے (عید کا پیغام' 1948ء)۔ ذات' برادری کی تقسیم اور شیعہ سنی کی تفریق ہمیں ایک قوم نہیں بننے دے گی' ان تفریقات کو ختم کر دیں۔ یاد رکھئے' ہماری کشتی کا لنگر اور ہماری عمارت کی بنیاد اسلام ہے۔ (پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن' مارچ 1944ء)۔ جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعل موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے۔ (پیغام عید 13 نومبر 1945ء)۔

رویت ہلال اور علمائے کرام

جن مہینوں کے ہلال کو ہمارے معاشرہ میں خاص اہمیت حاصل ہے ان میں شائد ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جس کی رویت ہلال میں ہر سال اختلاف نہ ہوتا ہو۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی اپیل کیجئے تو فوراً ایک حدیث پڑھ کر سنا دی جاتی ہے کہ ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے''۔ دنیا کی کسی کتاب حدیث میں یہ حدیث موجود نہیں' لیکن اسے خوب اچھالا گیا ہے۔ جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ قوم میں اختلافات باقی رہیں اور پارٹی لیڈرشپ پر زد نہ آئے۔ امت میں اتفاق و اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا تقاضا ہے کہ ہر سال کی اس بیکار الجھن کو بالکل ختم کر دیا جائے اور اسکی صرف ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ اہل مکہ کے فلکی حساب پر اعتماد کر کے اعلان کر دیا جائے کہ فلاں دن سے فلاں مہینہ شروع ہوگا۔ یہ اس لئے کہ ہمارے اندر سوائے رخ قبلہ کسی اور بات میں اتفاق نہیں اور نہ ہی بغیر اتباع کعبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے علمائے کرام کو فلکیات کے علم پر غالباً کوئی اعتماد نہیں کیونکہ حدیث شریف میں صرف اتنا آیا ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس روزے پورے کرو۔ امت میں وحدت پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لئے اگر ہلال رمضان وعید میں بھی فلکیات پر اعتماد کر لیا جائے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟

اجتہاد کب ضروری ہے

بہت مشہور حدیث نبوی ﷺ ہے کہ جب اسلامک سٹیٹ کی مرکزی اتھارٹی حضور نبی کریم ﷺ نے جناب معاذؓ بن جبل کو یمن کا قاضی یا گورنر بنا کر بھیجنا چاہا تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کے مابین فیصلے کیسے کیا کرو گے' تو انہوں نے جواب دیا کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کروں گا' پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تجھے وہاں اس حوالے سے کچھ نہ ملے تو پھر کیا کرو گے' تو انہوں نے جواباً عرض کیا کہ تب میں سنت رسول اللہ ﷺ کی بنیاد پر فیصلے کیا کروں گا' پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ اگر تمہیں وہاں بھی کچھ نہ ملے تو پھر کیا کرو گے' تو انہوں نے عرض کیا کہ پھر میں اس معاملہ میں مزید غور و فکر کروں گا اور اس کی بنیاد پر فیصلے کیا کروں گا' اسے سن کر رسول اللہ ﷺ نے اپنے قاضی کو دعا دی اور اللہ کا شکر بجا لائے کہ ان کی تعلیم و تربیت سے ایسا فہم اور ایسی بصیرت امت کے قاضیوں اور گورنروں کے قلوب و اذہان میں راسخ ہوگئی ہے' یہ اور اس طرح کی مسلمہ نبوی احادیث سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ حدیث یا سنت کی ضرورت اس وقت پڑے گی جب ہمیں کسی مسئلہ میں کتاب اللہ سے اصولی طور پر کوئی رہنمائی نہ مل سکے' لیکن اگر کتاب اللہ سے کسی مسئلے یا عقیدے پر دو اور دو چار کی طرح واضح اور دوٹوک انداز میں رہنمائی مل رہی ہو تو اس کے ہوتے ہوئے ایسی روایات کو اپنے سینوں کی زینت بنا لینا جو عصمتِ انبیاء کو بھی داغدار کرتی ہوں' صحیح نہیں۔

(بشکریہ جنگ' لندن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر محمد سلیم، مانچسٹر

اساس پاکستان خطرے میں

پاکستان اپنوں اور غیروں کی ہزار ہا مخالفتوں کے باوجود اسلام کے نام پر (دوقومی نظریہ کے تحت قرآنی حکومت قائم کرنے کی خاطر) معرض وجود میں آیا تھا۔ اسلام ایک نظام حیات (دین) ہے جس کا آئین قرآن ہے۔ یہ مذہب نہیں بلکہ دیگر نظام ہائے زندگی مثلاً بادشاہت، آمریت، مغربی جمہوریت، نظام سرمایہ داری، سیکولرازم وغیرہ کے متضاد ایک اجتماعی نظام زندگی ہے۔ چونکہ یہ نظام انسانوں کے تراشیدہ ہر نظام کی ضد ہے اس لئے ہر مفاد پرست گروہ اور دنیا کی ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت لازمی ہے۔ آج کل ایم کیو ایم کے لیڈر الطاف حسین نے بھارت یاترا کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کی آتما کا اثر لے کر قرآن کے قاری کے بھیس میں (فوٹو جنگ) علامہ اقبالؒ کے خواب اور دوقومی نظریہ یعنی نظریہ پاکستان کے خلاف بیان بازی سے اساس پاکستان کے لئے لاانتہا خطرات پیدا کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ مسٹر الطاف حسین فرماتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر ایک امہ، ایک ملت تو ضرور بن سکتی ہیں لیکن ایک قوم ہرگز نہیں بن سکتی۔ عرض ہے کہ قرآن کریم میں ملت کا لفظ مسلک ومشرب اور دینی طریقہ کے لئے آیا ہے۔ یعنی وہ طریقہ جسے وحی خداوندی کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کیا تھا اور اسلام ملت ابراہیمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ یہود ونصاریٰ تم سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کی ملت کا اتباع نہیں کرو گے۔ امت اور قوم کے الفاظ مرادف معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں ایک نسل کے افراد مل کر ایک گروہ کی شکل میں رہتے تھے قرآن نے انہیں بھی قوم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً قوم ثمود وغیرہ۔ عصر حاضر میں قومیت (Nationalism) کا معیار اشتراک وطن سے ہے یعنی ایک وطن کی حدود میں رہنے والے تمام افراد، خواہ وہ کسی نسل سے متعلق ہو اور ان کا مذہب بھی کچھ ہی کیوں نہ ہو، مل کر ایک قوم بنتے ہیں۔ قرآن کریم نے قومیت کے ان معیاروں کی نفی کی اور کہا کہ قومیت کا مدار آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک پر ہے۔ اس اعتبار سے دنیا میں صرف دو ہی قومیں آباد ہیں۔ ایک وہ جو قرآن میں عطا کردہ آئیڈیالوجی پر ایمان رکھتی ہے جسے امت مسلمہ یا جماعت امت مسلمہ یا جماعت مومنین کہا جاتا ہے اور دوسری قوم ان انسانوں پر مشتمل ہے جو اس آئیڈیالوجی پر ایمان نہیں رکھتے، انہیں **قوم الکافرین**، نہ ماننے والوں کی قوم کہا جاتا ہے۔ دوقومی نظریہ پر ایمان رکھنے والے قائداعظمؒ نے یہ کہتے ہوئے کہ قومیت کا مدار اشتراک ایمان پر ہے، ہم جیسے ناشکر گزاروں اور ناقدروں کو

پاکستان لے کر دیا۔ نیز جب تک دین قائم رہا عرب کے علاوہ دیگر متعدد ممالک کا انتظامی مرکز (دارالخلافہ) ایک ہی تھا اور ان سب ممالک کے مسلم باشندے ایک ہی امت (قوم) کے افراد تھے بے شک ان کی علاقائی' صوبائی ثقافتی اور لسانی پہچان الگ الگ تھی۔ ان ممالک کے غیر مسلموں کو ذِمّی کہا جاتا تھا کیونکہ ان کی جان' مال' آبرو اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔

قائداعظمؒ کے بیانات کی غلط تشریح

پاکستان مخالف اشخاص کے سوا' ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان دوقومی نظریہ کے تحت اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کی خاطر بنایا گیا تھا صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں۔ دونوں طرف سے ہجرت کا سبب ہندوؤں کی طرف سے ماسٹر تاراسنگھ کے ذریعے فسادات تھے۔ مشکل یہ ہے کہ آج تک پاکستان کی صحیح تاریخ مدون ومرتب ہی نہیں کی گئی اس لئے چند پاکستانی مسلمان بھی غیروں کے اتباع میں عقل کو بالائے طاق رکھ کر بغیر سند اپنے اپنے جذباتی خیالات کو قائداعظمؒ سے منسوب کئے چلے آرہے ہیں جس کا نتیجہ کنفیوژن ہے۔ علاوہ ازیں ایک پاکستانی مذہبی لیڈر وصوبائی وزیر جنہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا تھا' کے فرزند موجودہ صوبائی وزیر نے تو پاکستان کو قائداعظم کا فراڈ قرار دیا تھا۔ قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر پر غور کیجئے۔ جس کا غلط مفہوم لے کر ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جس پر ایم کیو ایم کے قائد جناب الطاف حسین اور محترم جسٹس محمد منیر نے بھی اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے' بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دوقومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصور کی نفی کر دی تھی' بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیم ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائداعظم کو پاکستان کی پہلی مجلس آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے پہلے قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف وحوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اس لئے وہاں مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا..... پاکستان میں صورت حال اس کے برعکس ہوگی' یہاں ہندو اقلیت میں ہیں' اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مورخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا تھا جس سے ہندو عوام خوف وہراس سے کانپ اٹھتے۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائداعظم نے اپنی تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے جملہ اہل پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا ''تم آزاد ہو' تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤں یا مسجدوں میں یا مملکت پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو' اس کا امور مملکت سے کچھ تعلق نہیں..... میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو' ہندو رہے گا نہ مسلمان' مسلمان..... مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں' کیونکہ وہ ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا ان سب

کے پاکستان کے ''شہری'' ہونے کی حیثیت سے' سیاسی نقطہ نگاہ سے ہوگا''..... یہ ہیں قائداعظم کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر' اسلامی نظام حکومت کا تصور ذہن میں نہ رکھنے والوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ کچھ مسلمان کے علم وعقل کی حالت ہے اس کے برعکس ہیکٹر لکھتا ہے۔ تقریر کے الفاظ بلاشبہ قائدِ اعظم کے تھے لیکن ان کے پیچھے فکر اور عقیدہ وہ تھا جو تیرہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام نے سکھایا تھا ''خدا کے سامنے سب انسان برابر ہیں تمہاری جانیں اور مال ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ میں دور جاہلیت کے رنگ ونسل کے تمام نشان آج اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ 14 اگست 1947ء کو مملکت پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا حلف اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر قائداعظم نے تمام پاکستانیوں سے باہمی اخوت اور بھائی چارے کی اپیل کی۔ انہوں نے کہا ''پاکستان کے تمام شہریوں کے حقوق ہی نہیں فرائض بھی یکساں ہوں گے''۔ یاد رکھئے اسلامی مملکت کا آئین قرآن ہوتا ہے اس لئے وہاں کا غیر مسلم شہری قانون سازی میں شامل نہیں ہوسکتا' نہ ملک کا سربراہ بن سکتا ہے اور نہ ہی فوج میں بھرتی ہوسکتا ہے کیونکہ اسلامی ملک کی سرحدوں کی حفاظت شہید اور غازی کیا کرتے ہیں۔ البتہ ملک کی انتظامیہ میں قابلیت کے مطابق ہر شخص مساوی حق دار ہوتا ہے۔ اسے حقوق میں ڈنڈی مارنا نہیں کہا جاسکتا۔

(بشکریہ جنگ' لندن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

تبصرۂ کتب

''نسیم ارم''

محمد سرور رؔجا صاحب نوٹنگھم' یو۔کے میں رہتے ہوئے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ قابل صد ستائش ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے فارسی کلام کے منظوم اردو تراجم میں ایک طرح سے تخصص حاصل کر لیا ہے۔ ''نسیم ارم'' علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کی کتاب زبور عجم کا اردو منظوم ترجمہ ہے۔ ترجمے کے لئے کم از کم دو زبانوں پر عبور ہونا لازم ہوتا ہے۔ منظوم ترجمے کے لئے زبان و بیان کی مہارتوں کے علاوہ فن عروض و قافیہ سے واقفیت لازمی و لابدی ہوتی ہے۔ یہ تمام خوبیاں مترجم موصوف میں موجود ہیں۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے الفاظ اور مفہوم وہی رہیں اور ترجمہ بھی منظوم ہو جائے اس کام کے لئے بہت قابلیت اور جگر پاش مشقت کی ضرورت ہوتی ہے جس سے رؔجا صاحب بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

''ہالۂ نور''

''نسیم ارم'' کے علاوہ ''ہالۂ نور'' کے نام سے اقبال علیہ الرحمتہ کی رباعیات (جو کہ ''لالۂ طور'' کے نام سے پیام مشرق میں شائع ہوئی تھیں) کا اردو منظوم ترجمہ بھی از رؔجا صاحب شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں اقبال کی ہر فارسی رباعی (یا قطعہ) کے ساتھ اے جے آربری کا انگریزی ترجمہ اور اس کے بعد اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔

کلام اقبال کی تفہیم و تذویق کے لئے مذکورہ بالا دونوں کام تعریف کے قابل ہیں۔

محترم سرور رؔجا صاحب نے اس کے علاوہ ارمغانِ حجاز' جاوید نامہ اور مثنوی ''پس چہ باید کرد'' کا بھی منظوم اردو ترجمہ کر رکھا ہے جو کہ زیر طبع ہے۔

''نسیم ارم'' کی ضخامت تقریباً 200 صفحات ہے اور قیمت پاکستانی روپوں میں 400 اور برطانوی کرنسی میں 10 پونڈ۔ ہالۂ نور تقریباً 150 صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت درج نہیں ہے۔

دونوں کتابیں اچھے گٹ اپ میں چھاپی گئی ہیں اور درج ذیل پتہ پر مل سکتی ہیں۔

بزم علم و فن پاکستان / انٹرنیشنل

11 شان پلازہ' بلیو ایریا' اسلام آباد

پوسٹ بکس نمبر 1935

What is the genuine end?
The Individual or The State?

By G.A.Parwez
English Rendering and Editing by
Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque

==========

The shackles and the tyrants were the blunt tools, which the exploiters used to use in the past. It is as if the kings had physically actualized exploitation in those days but the democracy of the present time has made it out and out a mental problem. Now the master does not say: **"Think in terms of what I think otherwise you will be killed."** Now he says: **"You are free to have your own thinking. In spite of this disagreement your life, property, and the other possessions will all be safe. All that would happen is that you would be lonely in the society. You will live with the people, deprived of your human rights. Your fellows will hate you as a filthy thing is despised, even those who think you are innocent and faultless will sever relations with you, so that the people may not hate them."** The master says to them; **"Go and be in peace; I have spared your life."** But this is the life, which is even worse than the death. **(The Dying Self, P. 185.)**

Such is the status of the individual in democracy. In this system snapping ties with the majority, the individual becomes wet paint; no one wants to develop relations with him. He remains lonely, deserted, dejected in the whole wide-world. What happens to the people left lonely in the living society can well be judged from the book "Lonely Crowd" published recently in America. With the help of the data and detailed observations of the individuals, the authors of the book have presented the status of the American society. In such a society an individual lives along with other members of the society as the cogs of a machine. During the last two or three years, I have mostly been citing quotations from the various books of an American psychologist, Erich Fromm. In one of his books, **Escape From Freedom**, one reference from which I have already given, he writes on this topic:

> **The person who gives up his individual self and becomes an automation, identical with millions of other automations around him, need not feel alone and anxious any more. But the price he pays, however, is high; it is the loss of his self. (P. 209)**

In another of his books, **The Revolution of Hope**, he writes '**the society in which the man is dehumanized, his political freedom does remain no more freedom,**

but slavery' (P. 91). The same author further writes that the obligation of society is to respect human life. The positive or the good act is the one that facilitates the development of the individual's latent potentialities. The negative or evil act is one that strangulates the life and stagnates the human activities (P.93).

Ernst Cassirer, who has been mentioned earlier, is a world known philosopher. He died recently. His last book, **The Myth of the State**, is about the problem of State. Discussing on the rights of individual and State, he writes:

> **There is, at least, one right that cannot be ceded or abandoned: the right to personality . . . There is no *pactum subjectionis*, no act of submission by which man can give up the State of a free agent and enslave himself. For by such an act of renunciation he would give up that very character which constitutes his nature and essence: he would lose his humanity. (P. 175)**

Discussing the rights and responsibilities of the individual and State, Professor I. MacIver, in his book **The Modern State** writes that the State governs to serve individuals. It controls the wealth of the country to repay the debt of individuals. It creates the rights, not to give charity as an upper hand on the basis of authority it enjoys, but as its agent. Keep it in mind that the individuals are the masters, not the slaves, of the State. It is clear the slave cannot enjoy a higher authority than the Master can. As are human rights determined and restricted in terms of their responsibilities, so ought to be the rights of the State (in relation to its responsibilities) (P. 480).

Right from here the weakness of Aristotle's simile of body-and-organs relation becomes clear. It was this simile on the basis of which he called the State 'the end' and the individual the means to that end'.

The Hollowness of Aristotle's Simile

He said it is the body alone that has existence; the organs do not have their separate distinct entity. This assertion opposes reality. The existence, in fact, is of the limbs and the organs, and not of the body. The body is simply the collection of limbs and organs, mutually linked with co-ordination, co-operation, proportion, and regulation. You go on cutting separately the various organs of the body, the legs, the arms, the torso, the head etc., you will see these parts lying separately, but the body will disappear. The existence of the body is merely a mental and conceptual phenomenon. Intrinsically it does not exist outside. Health is a balanced proportion of the various limbs and organs. When any one or some organs lose this balanced proportion and fail to perform their operation, it is called disease. If any organ becomes deadly poisonous, it is generally said 'in order to save the body, the essential thing is to cut it off'. This is said simply because of the general use of this word (body), otherwise, factually, it should be said 'it is essential to cut it off for the sake of health and safety

of other organs'. This makes it clear that the individuals have their own separate identity and existence. No State can come into being, if prior to it the individuals do not exist. If there is no existence of State as a distinct entity, there can still be individuals living. But if there are no individuals, the State can never be thought of. When the individuals determine to live with mutual agreement, discipline, co-operation, and balanced proportion; they also determine to gain power for their safety, and survival, then this way of life will be termed as society or State.

The simile of **'individuals as organs and State as body'** was, in fact, coined for Plato's theory of division. According to this theory slaves remain slaves forever, and the ruling class, he calls Guardians, always the ruling class and its example is like of organs of body. The foot always remains the foot and so is the head. The foot, by enhancing its potentialities, never replace the head and vice versa. Every organ has its own position determined by birth and there can be no change in it. Therefore, no organ should aspire to become another organ, and neither should it try it. Nor should the low-level organs rebel against their assigned duties only because these are of low level. With this simile, Plato said that the class division was by birth and was unchangeable. Aristotle, with this simile, made individuals the slaves of the State. It is clear how misuse of similes transforms the right into wrong and vice versa. Sir Mohammed Iqbal, the renowned Muslim thinker, interprets it as the magic spell of the ruling class.

Aristotle coined this simile; Hegel founded the entire edifice of politics on it. The result is that everywhere in the world there is autocracy, whatever name it is assigned. In this regard, there is no difference between dictatorship and western democracy.

This spell of the ruling class functions with the illusory concept of the State, which is an end in itself, and the individuals are the means to justify it. Erich Fromm makes this difference of dictatorship and true democracy clear in the following words:

> **Democracy is a system that creates the economic, political, and cultural conditions for the full development of the individual. Fascism is a system that, regardless under which name, makes the individual subordinate to extraneous purposes and weakens the development of genuine individuality. (Escape From Freedom, P. 301)**

Bergson (1859-1941), a French philosopher, has explained this important point in the following words:

> **This will be sovereignty, not over men, but over things, precisely in order that man should no longer have so much sovereignty over men. (The Two Sources of Religion and Morality. P. 300)**

Lust for Power

Cassirer says that this holistic, autocratic, comprehensive, and cruel concept of the State is the creation of people's lust for love. About this lust, he writes:

> **Obviously we do not wish for the sake of wishing - we aim at a certain end and we try to attain this end. But the lust of power does not admit of any possible attainment. It is the very character and essence of the will of power that is inexhaustible. It can never come to a rest; it is a thirst that is unquenchable. Those who spent their lives in this passion are comparable to the Danaides: they strive to pour water into a leaking butt. The appetite for power is the clearest example of that fundamental vice that, in Plato's language, is described as "pleonexia" – as the "hunger for more and more." This craving for more and more exceeds all measure and destroys all measure – and since measure, right proportion, "geometrical equality" had been declared by Plato to be the standard of the health of private and public life, it follows that the will to power, if it prevails over all other impulses, necessarily leads to corruption. "Justice" and the "will to power" are the opposite poles of Plato's ethical and political philosophy. (The Myth of The State. PP. 74 – 75)**

And when this lust for power is concealed in the sacred robe of "State Interest", these lust hungry mongers lose the prick of their conscience, which often rises against the open tyranny. You make the other men means of consolation for satisfying your own passions of revenge, and torture them, then (even if your own conscience is dead) the other people will protest against it. But when this is said, **"Doing it is in the interest of the State"**, then in stead of opposing it, the people will generally extend support to it. You will be thought of as a patriot and well wisher of the State. Strangely no body will ask you whether doing this is really in the interest of the State. If any body raises a voice against it, he is told that the disclosure of this secret is not in the interest of the State. Nonetheless, as has been explained earlier, the existence of State is an imaginary concept. By eradicating this deceptive idea, if it is clarified in mundane terminology, then the end and standard of collective system of men will be the interest of the individuals. This is such a concrete standard where neither can any one be deceived, nor can any one deceive some one else. But the concept of State is an amazing show where the State is rich and the individuals are poor; where the State is strong and powerful and the individuals are weak, feeble, and frail. And where the wealth of the State increases and the individuals go on becoming poor to poorer to the poorest. (According to the erroneous simile of Aristotle) the organs become gaunt but the body is said to be growing strong and stout. The organs are crushed or cut off one by one, but it is understood that the body is being nourished. The development, prosperity, robustness, and energy are, in fact, of those with whom the authority is vested.

(As has been described) "State" is the name of these attributes; it does not have a separate distinct existence. If, anyhow, one has to acknowledge the existence of this "phoenix", one must accept and make others accept the reality that the criteria of measuring the prosperity, the strength and the weakness of the State are the individuals of the State. If the individuals are prosperous, strong, stout, and dauntless, the State will also be rich and powerful. If the individuals are always prey to fear, pain, grief, and destitution, the State is dried-up and struck with poverty. That is why Mohammed Iqbal, the world reputed Muslim philosopher, has said, **"Every individual is the glaring stroke of good fortune of the nation, of the State".**

From the aforementioned illustrations we have seen that by carving the non-existent idol of the State, how man's lust for power has made wide pathways for tyranny! And how well it has justified them! How much blood of humanity has been sacrificed on the altar of the old hag, the black deity! How many sacrifices of man burnt on stakes are there, with which the sadistic nature of the tyrants is satisfied! The fact of the matter is that whatever the priests, in theocracy, do in the name of God, the same, in secularism, is done in the name of the State. Neither could any one ask God "Was whatever is done with us in Your Name really your demand"?. Nor can any one ask the goddess of the State "Are whatever sacrifices we are compelled to offer, really under your authority"? The God of theocracy was imaginary and conjectured; the deity of the State is also mental and imaginary. One was the deceitful idea conjectured by the Hindu priests, and the other is the spell-ridden concept knit by the Hindu bankers. The only difference between the two is: one was knitted at the looms of dark ages, so it was coarse and thread-bare; the other is made by the machines of modern civilization, hence is so fine and subtle that no eye is able to penetrate to the inherent deception it has.

Qur'an's Truth-Revealing Message

The Qur'an was revealed. It exterminated all the man made idols from the mental horizon of humanity. The Qur'an brought the collective infrastructure of the man. But you will be taken aback to know that the word State is not found in it. It has given only two ingredients of this infrastructure: One is the country, a track of land and the other is man, the inhabitants of that country. It defines and determines the borders of the country for initiating its program. In other words, it starts its program from a track of land; it is the only possible and easy method, otherwise it has the entire globe of earth as its aim. It wants to spread this system in the entire world. It insists to protect this piece of land (which has to be the first lab of this program). It is because if it remains safe and secure, this experiment will be conducted peacefully. It also insists to make arrangements for protecting it from the earthly and heavenly calamities. It describes the events of the nations gone by and tells us that their abodes were destroyed by the floods, wind storms, earthquakes, volcanic eruptions, and the dilapidation of the dams. The purpose is to tell us to keep the country safe and secure

from such calamities and catastrophes. It also emphasizes to protect the country from external dangers. In this regard, it says:

وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا ٱسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ ٱلْخَيْلِ
تُرْهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَءَاخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ ٱللَّهُ
يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَىْءٍ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ
لَا تُظْلَمُونَ

(8: 60)

Keep ready whatever force you can muster to meet your enemy together with strong cavalry with which you can strike terror in the hearts of those who are enemy to Allah and to you. And to those who are in your knowledge, and those besides them whom you do not know as yet. To do so, huge expenses are involved. For this purpose, whatever you expend in the cause of Allah shall be repaid to you justly. There will be no reduction in it -not even a bit.

The State was an imaginary concept. In contrast to it, country is the name of a track of land. When we say the country is in danger, its danger can be perceived, can be seen. No body can deny it. The magnitude and the nature of this danger can be judged on the basis of the information one acquires. But its relation pertains to the degree of perception; it is not imaginary like that of the State.

What is real End /aim?

Despite emphasizing the importance of guarding it, the Qur'an deems the State the means to an end **not** an end in itself. A house merely serves as a residence for the people who live in it. True that the condition of a house affects the welfare of its occupants but the real importance is for the residents not the residence. To the Qur'an, Man is the real end of the existence of the country or the state or the entire Universe. Everything has been created for Man's benefit. The concept is clearly stated in the following verse.

هُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ لَكُم مَّا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا

(2:29)

Whatsoever is there in this sphere of earth, God has created it **for you**. Not only in the earth but also:

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ
لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

(45: 13)

'Whatsoever is there in the earth and the heavenly bodies, God has all harnessed for you'. In the words of Sir Muhammad Iqbal, the renowned Muslim philosopher:

You are neither for the earth, nor for the heavenly bodies
The entire universe is for you, and not you for it all

And further he adds:

With the warming activities of the man, is the entire tumultuous upheaval
Each and every body in the universe, the sun, the stars, is but spectators

This is the relation of Man with the Universe. But the topic under discussion pertains to the question of **mutual relation of man with man**. It is this mutual relation which gives birth to the concepts of civilization, culture, sociology, and politics; this generates various systems, rules and regulations. I have already mentioned that the Qur'an has not used the term 'the State'; it has definitely given the idea of a country, and within this concept, it has also propounded the concept of governance. We have seen the flaw in the theory of the State which was, in fact, the flaw in the system of sovereignty. The Qur'an has termed the system of sovereignty as the governance, as the management of things. Now the question arises: **what is the Qur'anic concept of sovereignty or of the system of governance? And what is the place and status of the individuals in it?**

The Qur'anic Concept of System of Governance

Whatever the system of governance in vogue in the world, the authority of some men over others remains established in one way or another. The Qur'an considers this concept as humiliating to humanity. It does not allow some men to wield authority over other men. It calls it against the concept of equality of human beings and terms it opposite to the respect of manhood. It says that the governance of men over men is wrong because it deprives the individual of the freedom he gets as man.

No human society can be sustained without a system of governance. So, what does the Qur'an suggest? It says the sovereignty belongs to God alone not to any individual or group of individuals. But, is it not theocracy/autocracy all over again, which vested sovereignty with some invisible forces beyond complaints or questions? The Qur'an responds very reasonably to this very logical question. Granting the existence of an invisible Sovereign in the Qur'anic system, there are laws which are real and visible. God's rule practically means following His Law, which is complete and unchangeable. No one has the authority to make any changes in the Divine Code, not even the Messenger. He addresses the Messenger

(5: 48) فَٱحۡكُم بَيۡنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُۖ

'Judge the matters of these people according to the Book of Allah'

And declare it openly that:

(10: 15) مَا يَكُونُ لِيٓ أَنۡ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلۡقَآيِٕ نَفۡسِيٓۖ

It is not for me to make any changes therein according to my wishes.

What a great satisfaction have the individuals of the society (nay but the entire humanity) acquired that the governance over us will only be of this Book alone! Orders will only be of His to be executed. Other than Him, nobody will have the right to make us obey him. Even the one who makes us obey His Laws will himself first obey these Laws. From this point of view, there will neither be any ruler nor any ruled.

The End of *Nubuwwah* as Manifesto of Freedom

I have just said that the satisfaction (that no one among us will be able to exercise authority over others, the obedience will only be to this Book, the Qur'an) was not only restricted to the men of the time of the Messenger (pbuh). It will also be equally applicable to the last man on earth. It was because after the completion of Al-Qur'an, it was promulgated that the sequence of ***Nubuwwah*** has finally ended. Now nobody till the day of resurrection will be able to say that your Allah has ordered to obey him compulsorily. Whatever Allah had to say has finally said in this Book From now onwards neither will Allah say any thing else, nor will there be any change, amendment, and modification in it. It was our hard luck (and I will say it was the biggest controversy against Islam) that the **End of *Nubuwwah*** was made just a matter of belief. Otherwise, up to the day of resurrection, it was a manifesto of freedom, and the message of death for every kind of slavery, for manhood. Pause and reflect, what a great and magnificent promulgation it was that a man, a group of people, or a nation that intends to get freedom from the slavery of men may accept this Book, and understand it! Imposed on its freedom will only be those restrictions, which have been prescribed in this Book. Now, nobody will be able to say that not only him, but also Allah has imposed such and such additional restrictions on you or has made changes in these restrictions. This was the Universal Manifesto of Freedom, which the End of ***Nubuwwah*** has granted to the entire comity of human beings. In other words it was the surety that from now onward nobody, nor any group of people, will be vested with the authority to command obedience. Nor will any body or any group of people be vested with power to impose any restrictions that are not in this Book whether that is in the name of the State or in the name of God Himself. Could there be a bigger freedom than that ever conceptualized? Or can it be imagined?

The Purpose of These Restrictions

Now the question is what is the purpose of the limitations or the restrictions prescribed in the Book of Allah? The purpose of man-imposed restrictions on other men is either to decrease or to restrain the vested authority of those on whom these restrictions are imposed. In other words it targets to limit or to divest their freedom. But the Qur'an says that God-imposed limitations and restrictions never mean to limit or to divest human freedom. The aim is never to achieve that purpose.

On the contrary:

(2: 286) لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

'The purpose of God-imposed restrictions is to further broaden the human personality.'

Enlarging and broadening the latent potentialities of the human personality is a psychological process, the discovery of which could have been possible (that too to a limited extent) with the development of the discipline of Psychology in the present times. Prior to this development, it was least understood. The psychologists say if the energy of the human personality that is operating for destruction is diverted to constructive pursuits, it multiplies two-fold for integration process. This process, in their terminology, is called ***sublimation.*** Fourteen hundred year ago, the Qur'an unfolded this reality. It says that the purpose of the restrictions imposed on the human personality is to broaden it by sublimation.

(2: 286) لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

By obeying the Divine Laws, the human personality is broadened. This may also mean that for the accomplishment of the task assigned, one should exert one's capacities to the full. On the ordinary level, understand this phenomenon with the following example. When water in a canal starts flowing at a low ebb, a fall of stones is built in it. The purpose is not to impede the flow of water. When water bumps against it, its flow multiplies many folds. This is the purpose of imposing restrictions by the Book of Allah.

We have seen that it was said to the Messenger of Allah (PBUH): Establish system of governance according to the Book of Allah. One of its purposes was:

(7: 157) يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَـٰلَ ٱلَّتِى كَانَتْ عَلَيْهِمْ

'To lift the burdens under which humanity groans it will make them free from the shackles, which bind them'. Humanity will be made free from the chains of slavery tied so long on and this purpose in itself is great. But it is only the negative aspect. After shattering these shackles, and making humanity free from them, the Qur'an takes a positive step. For this purpose, the second aim of the Messenger of Allah (PBUH) is told as:

(62: 2) وَيُزَكِّيهِمْ

He (PBUH) works for the development of the personality of human beings. This responsibility was not restricted to the lifetime of the Messenger of Allah (PBUH). It had to move further, and it was the aim of the system that was established for the practical implementation of the Book of Allah. That is why it was said to the party of the people responsible for the establishment of this system:

(22:41) ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ

"These are the people who will establish System of ***Salaat*** when they have the control of the country and 'will give ***Zakaa".*** I have no time to explain this aspect of the program of the Islamic system of governance that has so comprehensively been given in this brief verse. I will deliberate upon one aspect that is related to the topic under discussion i.e., the broadening of the individuality, the development of personality. In our system ***Zakaat*** generally means "at the end of a year, giving some amount of money from one's wealth in the path of Allah". 'Giving some amount' is not the end product of the Qur'an. The Qur'anic exposition of this term is much more broad. It has been said here that the responsibility of the Islamic System is ***Eetta-e-Zakaat***, not "giving ***Zakaat***" or "receiving ***Zakaat***". The word ***Zakaat*** means: "to grow, to develop, to bloom and blossom". "***Eetta-e-Zakaat"*** means providing the means of development to individuals. It includes physical as well as personality development as far as the physical development of humans is concerned, it pertains to the Qur'an's system of economics. I have written quite extensively on this for the last 25 years. At this point of time I present the gist of this system through the saying of the Messenger of Allah (PBUH):

> **God's responsibility of protecting a community ceases, where even a single person goes to bed hungry,**

It was the same responsibility that the 2nd caliph Hazrat Omar (RA) repeated in his well-known words:

> **If a dog dies of hunger by the Tigris (river in Iraq), I swear by God with Whom rests my life, Omar will be held responsible for it.**

This very aspect of "***Eetaa-e-Zakaat***" is the obligation of the Islamic System that is related to satisfying the physical needs of individuals. As far as the development of the potentialities of the human personality is concerned, I may make it very clear that this is the ultimate end to be achieved by this system. The first article of this system is to create an atmosphere wherein is the state of

(2: 38) لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

'There is no fear and sorrow, no grief and anxiety, no agony and pain'. In other words the individuals of the society have neither any fear of external dangers, nor any grief and anxiety within their internal world. There is food for thought here. This aspect of the (Qur'anic) system provides a solid foundation for realizing the human potential. The system is obliged to carry out its responsibility, among others, of (in reference to the Messenger)

Another obligation of this system with reference to the Messenger of Allah (PBUH) is described in these words:

(62: 2) يُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ

He (PBUH) makes arrangements to educate them in such a way that they may be able to understand the **'why of law'** on one hand, and garnishes their intellect to enable them to grasp the depths of the mysteries of the universe on the other hand. He (pbuh) first says تُطَهِّرُهُمْ and then تُزَكِّيهِم (9:103). He (pbuh) not only nourishes the human potentialities, but also makes them able to utilize these developed potentialities in consonance with Divine Value. It inculcates purity of character and beauty in conduct. It is called sublimation process of character and conduct.

The Ultimate End

It should be clear from these illustrations that the Qur'anic view of (a) providing the Divine System of Guidance, (b) sending the Messengers (Peace Be Upon Them), (c) revealing the code of Divine Laws, (d) prescribing restrictions, and (d) keeping the final Book of God perfect, unchangeable, and protected -the logical consequence of which is the End of Messengerhood has **an end** to achieve. This **end** is the achievement of the following objectives:

- To make all human beings free from the shackles of slavery
- To develop the potentialities of humans
- To utilize these developed potentialities in consonance with Divine Values.

This process is denoted as purity of character. But further thinking in the Qur'an makes this reality clear that individual's growth and development is not the last stage of this process. Its next stage is to prepare a group of people, a nation whose **end** is the well being of human species. For such a kind of nation, it has been said that:

(3: 109) كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

'You are the integrated nation, equipped for the well being of the manhood. You are an ***Ummah*** raised for the good of all humanity'.

Judge the importance of this fact that the Qur'an has said of the individual:

(89: 29-30) فَٱدْخُلِى فِى عِبَـٰدِى ﴿٢٩﴾ وَٱدْخُلِى جَنَّتِى

If an individual desires to have a paradisiacal life, one has to join hands with other like –minded people (89:29-30)

Paradise is not created by retreating to the seclusion of monasticism and mysticism; it requires a social set up. In other words, individuals are an integral part of the group of people or of ***Ummah*** and the responsibility of the group or ***Ummah*** is the welfare and

wellbeing of the universal humanity. For the welfare of humanity, the Qur'an does not use the unambiguous terms like "interest of the State" or public interest. It clearly says

(13: 17) وَأَمَّا مَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى ٱلْأَرْضِ

'Always remember that which is beneficial for the humanity endures'; Everlastingness and permanence is only for the acts that are beneficial for mankind.

The Relation Between the Individual and the Party

I have presented the mutual relation between the individual and the State whatsoever I, with my own vision, have understood from the Qur'an. But we have a new terminology introduced in our times. It is Collectivism Theory. This theory is neither new, nor unique. It is, in fact, the changed name of Hegel's Theory of the State. According to this theory: interest of the State is the most important consideration. . It possesses an "organic" unity. Existence is only of society or party, and not of the individual. With this exposition of Collectivism Theory in view, there is no need to add any thing to what has been said of the State Theory. The Qur'an lays stress on collective life. And the antagonists of Collectivism Theory, presenting it in support of their theory, term it exactly in accordance with Islam. I thought it necessary to remove this confusion in a few words. Some of them have been heard saying that Iqbal, the great Muslim scholar, also held the same theory. It is ingeniousness of irony and undue criticism on Sir Mohammad Iqbal. Every one knows that Iqbal is a torchbearer of the philosophy of Self (I-am-ness). Self is another name of 'individuality'. The sum total of Iqbal's message is the development, preservation, and immortality of the individuality. He showers so much importance on the individuality of the human self that he does not allow this self to be absorbed in the Divine Self, let alone the State or the party s/he belongs to. He maintains its uniqueness. He wants to develop it so that it may emerge as an independent entity equipped with the facets of the Divine Self. He does not accept that it weakens, even at the cost of everlastingness of life. He says individuality cannot be strengthened in the solitude of mysticism; it develops and is strengthened while living in the company of people. That is why he lays stress on establishing link with the party, and not being absorbed in it; ***Ummah*** other than the individuals, to him, is nothing; it develops with the mutual link with each other. When these two synchronize with each other, it is called ***Ummah***. 'Individuals of the caravan' and the 'caravan' itself is the most appropriate simile in his poetry. The caravan other than the individuals has no existence. The individuals with their mutual sync constitute it. But it is necessary that the individuals may remain with the caravan so that being in the state of protection, secure and safe from the dangers, they may reach the ultimate destiny. The Qur'an establishes this relation when it says:

(3: 199) يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱصۡبِرُواْ وَصَابِرُواْ وَرَابِطُواْ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ

O Jama'at-ul-Momineen, Allah's Laws have reached you. Now you be steadfast yourself and cause others also to be steadfast, stand united and adhere to Allah's Laws so that you may prosper.

This is the mutual relation of the individuals with the party. In other words, it means the mutual relation of the individuals among one another is the cause of their steadfastness and reinforcement. There is no annihilation of self like the one in mysticism where it is absorbed in water and ends its uniqueness. And nor is it the System of the State or the Collectivism Theory in which the State or Collectivism is the end and the individuals the means only. The life-giving message of the Qur'an roots out all these theories. It has comprehensively covered individuality in a few words so wonderfully. It says the collective life is so good and so fair but:

(6: 94) وَلَقَدۡ جِئۡتُمُونَا فُرَٰدَىٰ

'You will confront Us as individuals with your individuality and will be called to account for your thought and conduct as individuals'. This is the focal point of the **Law of Requital**. The individuals try to achieve the prescribed ends of **Deen** in an organized way. This organized structure of theirs is termed as party or ***Ummah.*** Its objective is nothing but:

(9: 40) كَلِمَةُ ٱللَّهِ هِيَ ٱلۡعُلۡيَاۗ

the defeat of man-made system and the triumph of Allah's system. The world has tried various systems of life and has failed to get consolation from any one of these systems. The Man is tired now and is in search of a system, he sees nowhere. But this system is in the process of being in his thoughts. Erich Fromm sees its glimpse like the manner given below:

> **A society in which no man is a means towards another's ends, but always and without exception an end in himself; hence, where nobody is used, nor uses himself, for purposes which are not those of the unfolding of his own human powers; when man is the center, and where all economic and political activities are subordinated to the aim of his growth. A sane society is one in which qualities like greed, exploitativeness, possessiveness, narcissism, has no chance to be used for greater material gain or for the enhancement of one's personal prestige. Where acting according to one's conscience is looked upon as a fundamental and necessary quality and where opportunism and lack of principles is deemed to be asocial; where the individual is concerned with social matters so that they become personal matters, where his relation to his**

fellow man is not separated from his relationship in the private sphere. A sane society, furthermore, is one which permits man to operate within manageable and observable dimensions, and to be an active and responsible participant in the life of society, as well as the master of his own life. It is one which furthers human solidarity and not only permits, but stimulates, its members to relate themselves to each other lovingly; a sane society furthers the productive activity of everybody in his work, stimulates the unfolding of reason and enables man to give expression to his inner needs in collective art and rituals. (241-42)

This thinker calls this type of society as **The Sane Society**. And this is the very name of that book from which the above reference has been given. Very broadly and intensively the Qur'an describes the characteristics of this society. It covers its ultimate end in a few words when it says:

(17: 70) وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ ءَادَمَ

'Verily We have honoured every human being'. And protecting this honour is the end product of the society. If society or the system does not honour the prestige of the individual, it is a corrupt and cursed society, and is the root cause for deterring the accomplishment of the purpose of the creation of mankind.

The System, the State, the Society that deprives people of the individuality of a person, honour of mankind and allows grief-stricken life to pass has curse of Allah, of His Divine Forces, and of the Universal humanity. How alarmingly the Qur'an depicts such a life in the following verse:

(3: 87) عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ ٱللَّهِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلنَّاسِ أَجْمَعِينَ

'These people are deprived of Allah's blessings as well as the support of the Divine Forces and the righteous persons'. In the course of ages, this idea slowly dawned on man and gradually crystallized that the world is not merely changing, but is developing towards perfection.

From the deliberations I have made about "State Or Individual", it necessarily follows that the individual, and his personality is **an end in itself**. No man has the right to exploit another man or to use him as a means in furthering his personal interests. If society were organized on this basis, there would be neither rulers nor subjects. This is the second principle on which society in Islam is based. No man is permitted to compel others to obey him; Allah alone is to be obeyed through the Laws He revealed in the Qur'an.

****

END